البقرہ

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

سورت کا تعارف:

اِس سورۂ مبارکہ کا نام (البقرہ) ہے۔ یہ اِس کے مضامین کا عنوان نہیں بلکہ صرف ایک نام ہے، یعنی وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس کی کل ۲۸۶ آیات ہیں جن میں سے چند محدود آیات کے علاوہ باقی تمام سورت مدنی دور کے ابتدائی عرصے میں نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اِس سورت کو قرآن کی چوٹی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر چیز اپنی ایک ثریا اور بلند چوٹی رکھتی ہے، قرآن کی بلند اور اونچی چوٹی سورۂ البقرہ ہے۔

اِس مبارک سورت کی ابتداء (الف ، ل، م) کے تین مبارک حروف سے ہوتی ہے، سورت کے محوری اور اساسی مطالب بھی تین حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں جن کا خلاصہ سورت کی آخری آیت میں اِس طرح آیا ہوا ہے کہ آیت کا پہلا ٹکڑا پہلے حصے کا، دوسرا ٹکڑا دوسرے حصے کا اور تیسرا ٹکڑا تیسرے حصے کا عنوان قرار دیا جاسکتا ہے۔ اِس کے شروع سے اکہتر ویں آیت تک پہلا مضمون پھیلا ہوا ہے جس کا عنوان (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیت نمبر ۷۲ سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے جو آیت نمبر ۱۴۱ پر ختم ہو جاتا ہے اِس کا موضوع (لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ) ہے۔ اِس حصے کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ (تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ) اور تیسرا حصہ آیت ۱۴۲ سے لے کر سورت کے آخر تک ہے۔ اِس حصے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں، وقتاً فوقتاً پیش آنے والے واقعات اور معاملات کے حوالے سے رہنمائی اور احکام دیئے گئے ہیں۔

پہلے حصے کے شروع میں وہ لوگ اور اُن کی خصوصیات متعارف کی گئی ہیں جو قرآن کی رہنمائی سے مستفید ہونے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں۔ اُن کی پانچ اہم صفات کی نشاندہی کی گئی ہے: غیب پر ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، انفاق، عدم تعصب یعنی ہر "ما انزل اللّٰه" قبول کرنا اور دنیا کو دائمی نہ ماننا۔ اِس کے بعد کہا گیا ہے کہ اوپر دیئے گئے حقائق کے منکر (نہ کہ ہر کافر)، یعنی صرف وہ کافر جن کے کفر کی بنیاد درج بالا خصوصیات کی عدم موجودگی ہے؛ کسی طور ایمان نہیں لاتے۔ اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگی ہوئی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ نہ خود حقیقت کے ادراک کے قابل ہیں نہ دوسروں کی

بات سنتے ہیں اور نہ ہی اتنی بصیرت کے حامل ہیں کہ اُن کے چاروں طرف پھیلی ہوئی نشانیاں اُن کو راہ راست کی ہدایت کر سکیں۔ اِس کے بعد اُن لوگوں کے رنگ ڈھنگ بیان کئے گئے ہیں جو اِن دونوں گروہوں کے بیچ بیچ ہیں، اِن میں سے بعض پہلے گروہ کے زیادہ قریب ہیں اور بعض دوسرے گروہ کے۔ بعض ایسے ہیں کہ جب اُنہیں روشنی ملتی ہے تو بجائے اِس کے کہ اِس روشنی کو اپنے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنالیں اور اندھیروں میں بھٹکنے سے نکل آئیں یہ روشنی اُن کی بیمار آنکھوں کا رہا سہا (باقی ماندہ) نور بھی چھین لیتی ہے اور اُن کو اندھا کر دیتی ہے۔ بعض اُن میں سے ایسے ہیں جو حق کی جانب چند گام چل لیتے ہیں خصوصاً اُس وقت جب حق کے پہلو میں کسی دُنیوی فائدے کی جھلک بھی نظر آجائے مگر جب خطرے کا احساس گھیر لیتا ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ پھر یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ کس طرح تم اپنے اندر وہ تقویٰ پیدا کر سکتے ہو جس کے نتیجے میں یہ قرآن تمہارے لئے مشعل راہ بن جائے۔ یہ تقویٰ اپنے اُس رب کی عبادت کے نتیجے میں پیدا کیا جاسکتا ہے جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگ پیدا فرمائے اور زمین کو تمہارے لئے فرش اور آسمان کو چھت بنایا۔ وہی جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اُس کے ذریعے زمین سے غلہ اور پھل اُگاتا ہے، جس نے تمہاری رہنمائی کے لئے ہاتھ میں کتاب دے کر پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی کسی ایک چھوٹی سورت کی مانند کوئی چیز بھی کوئی دوسرا پیش نہیں کر سکتا، وہ کتاب جس میں آپ کو سمجھانے کے لئے نہ تو مچھر کے برابر کسی چھوٹی اور حقیر چیز کی مثال سے دریغ کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی بڑی چیز کی مثال سے۔ ایمان والے سمجھتے ہیں کہ یہ سب حق ہے اور اُن کے رب کی طرف سے ہے۔ صرف وہ لوگ اِس کے کافر ہیں اور ایمان لانے سے پہلو تہی کرتے ہیں جو فاسق ہیں، اُن تمام فطری روابط کے توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں جن کے جوڑنے اور مضبوط رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اُن کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُن کے اطمینان کے لئے کافی دلائل پیش نہیں کئے گئے بلکہ اِس کی وجہ اُن کا فسق، فساد اور تمام انسانی حدود سے منہ پھیر کر اُنہیں پھلانگنا ہے۔ اِس کے بعد آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جس کے تناظر میں اِس مطلب کی توضیح کی جاتی ہے کہ ہر شخص کو اُس کے ظرف کے مطابق مکلّف کیا گیا ہے۔ اُسے زمین کی خلافت اِس لئے سونپی گئی اور اُسے فرشتوں پر اِس لئے فضیلت عطا کی گئی کہ فرشتوں کی نسبت اُس کا علم زیادہ اور جامع تھا۔ ہر چیز کو سمجھنے اور اُس کو ایک خاص نام سے موسوم کرنے کی صلاحیت نہ فرشتوں میں تھی اور نہ ہی روئے زمین پر موجود کسی دوسری مخلوق میں۔ ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ آدم کے لئے سجدہ بجالائیں اور یوں کائنات کی تمام مخلوقات اُس کے لئے مسخر کی گئیں سوائے شیطان کے۔ پھر جنت میں آدم اور اس کی زوجہ علیہما السلام کے استقرار، شیطان کے وسوسہ کے باعث اُن کے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے اور اُس کے نتیجے میں جنت سے اُن کے اُتر آنے کا ذکر آتا ہے۔ اِس میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنت اور بلند مقامات سے نیچے اتر آنے کی وجہ کسی کا اپنا پیر پھسلنا ہی ہے، اگر کوئی شخص ہمیشہ کے لئے ملعون اور مردود ٹھہرتا ہے تو وہ خود ہی اِس کے

اسباب فراہم کرتا ہے اور اگر دوسرے کو توبہ کی قبولیت کا شرف حاصل ہوتا ہے تو وہ خود ہی اِس شرف و سعادت کا دروازہ اپنے لئے کھولتا ہے۔ یہی مفہوم بنی اسرائیل کے قصے میں بھی بیان ہوتا ہے اور اُن کے قصوں میں اِس کے تاریخی نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے قصے درحقیقت جنت میں آدم علیہ السلام کے استقرار اور دوبارہ نکالے جانے کے تاریخی نمونے اور مزید تشریح پیش کرتے ہیں۔ اُن کو من و سلویٰ کی نعمت اور ایک پتھر سے بارہ چشموں کا جاری ہونا، جنت میں آدم علیہ السلام کے استقرار کی مثل ہیں اور اُن کا فقر، بھوک، ذلت اور مسکنت سے دوچار ہونا ہمارے جدِ امجد کے جنت سے نکالے جانے کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ آدمؑ کو کہا گیا (اهْبِطُوْا مِنْهَا) اور بنی اسرائیل کو کہا گیا (اِهْبِطُوْا مِصْرًا) وہاں بھی ممنوعہ درخت کا پھل کھانا جنت سے محرومی کا باعث بنا اور یہاں بھی من و سلویٰ پر اکتفانہ کرنا اور مزید کی خواہش کرنا هبوط کا باعث بنا۔ پھر بنی اسرائیل کے اُس گروہ کا عبرتناک انجام جنہوں نے سبت کے دن کی حُرمت پامال کی، گناہ کے لئے مذہبی حیلہ تراش لیا اور مسخ ہو گئے، یہ دوسری مثال ہے۔ اِسی طرح اللہ کی عبادت کے بلند مقام سے تنزل، اتنا تنزل کہ اُنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، ایک اور نمونہ ہے۔

سورت کا دوسرا حصہ اِس طرح شروع ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں دین سے انحراف کی وجہ سے داخلی بدامنی، قتل مقاتلوں، ظالم کا دفاع اور ایک دوسرے پر تہمت طرازیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں اُن کے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے۔ اُن کے علماء نے دین میں تحریف شروع کر دی، منافقانہ طرز عمل اختیار کیا، مومنوں کے سامنے کچھ کہتے تھے اور اپنے بے ایمان ساتھیوں کی محفلوں میں کچھ اور۔ اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اُسے کلامِ الٰہی کا حصہ بنا کر پیش کرتے تھے اور اِس سے اُن کا مقصد لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنا مطلب نکالنا ہوتا تھا یعنی دین کو دنیا کے عوض بیچتے تھے۔ اُن کی داخلی لڑائیوں کا سلسلہ بھی اُس مقام پر پہنچ گیا کہ اُن کے معاشرے میں مظلوموں کی جان محفوظ رہی نہ مال اور نہ ہی عزت، کمزور اور بے کس لوگ مارے جاتے تھے اور اپنے گھروں اور گاؤں سے نکالے جاتے تھے۔ اللہ کے پیغمبروں، خداترس مصلحین اور حق کے علمبردار داعیوں کی مخالفت کی جانے لگی اور اُن کے قتل کے درپے ہوئے حتّٰی کہ ذلت کی اِس انتہا پر پہنچے کہ بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوئے مگر اِس کے باوجود سمجھتے رہے کہ وہ مومن ہیں، اللہ کے منتخب بندے اور جنت کے تنہا حقدار ہیں، دوزخ کی آگ سے ہمیشہ کے لئے مامون ہیں اور یہ کہ اُن کے علاوہ دوسرا کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ موقف رکھنے کے باوجود موت سے خوفزدہ بھی رہتے تھے، دنیا کے ساتھ افراطی محبت اور جہاد سے نفرت اُن کو اِس حد تک لے آئی تھی کہ اُن میں سے ہر ایک ہزار ہا سال تک جینے کا متمنی تھا۔ چاہے وہ زندگی کتنی ہی ذلت اور پستی کی کیوں نہ ہو اور کسی کی بھی غلامی میں اور کسی کی بھی بالادستی کے نیچے کیوں نہ بسر ہو رہی ہو۔ اُنہوں نے اللہ کی کتاب کو اِس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے اُن کو کچھ سمجھ ہی

نہ آرہا ہو اور اُس کی بجائے جادو، ٹونے، تعویذوں اور فال گیری کے درپے ہو گئے تاکہ اُس کے ذریعے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیں۔ عبادت کرنے والوں کے راستے میں رکاوٹ اور عبادت گاہوں میں لوگوں کے جانے میں مانع ہوتے تھے مگر اِس کے باوجود اپنے آپ کو اللہ کے گھرانے کے مخصوص افراد، پیغمبروں کے وارث اور جانشین سمجھتے تھے اور اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف رکھتے تھے۔ اُن کے اِس عمل کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ابراہیم علیہ السلام مشرک نہیں تھا۔ آپؑ نے جب اپنی اولاد کے لئے لوگوں کے رُشد و ہدایت کی امامت اور قیادت کی دعا کی تھی تو بھی اللہ تعالیٰ نے اُس کے جواب میں فرمایا تھا کہ یہ مقام ظالموں کو عطا نہیں کیا جاسکتا۔ ابراہیمؑ نے تو کعبہ اِس لئے تعمیر کیا تھا کہ یہ امن کی جگہ ہو گی، امن کا باعث ہو گی اور یہاں پُر لوگ امن و اطمینان کے ساتھ اللہ کا ذکر اور عبادت کر سکیں گے۔ اُنہوں نے تو خواہش کی تھی کہ یہاں کے لوگ اللہ کے شاکر بندے ہوں، اُن میں ہمیشہ ایسے پیغمبر مبعوث ہوتے رہیں جو اُن کو دین سکھائیں اور اُنہیں گناہوں سے بچائیں اور اپنی اولاد کو اُنہوں نے ایک خدائے واحد کی عبادت کی وصیت کی تھی۔ یہ تھیں ابراہیمؑ اور تمہارے جد یعقوبؑ کی وصیتیں، پھر تم کس طرح اپنے شرک، فساد، ظلم، دین اور دینداروں سے دشمنی کے ارتکاب کے باوجود اپنے آپ کو اُن کے ساتھ منسوب کرتے ہو۔ یہ حصہ اِس آیت پر ختم ہوتا ہے: (تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)

تیسرا حصہ علیٰحدہ علیٰحدہ احکام پر مشتمل ہے اور سورت کے آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں تحویلِ قبلہ کا حکم اور اُس کے ساتھ مربوط احکام، پھر اللہ کے راستے میں ثبات اور استقامت، خوف اور بھوک کی حالت میں صبر اور برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دینا، مشکلات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور نماز کے ذریعے اُس کی مدد کے حصول کی جُستجو، کتمانِ حق سے اِحتراز، حلال اور پاکیزہ رزق پر قناعت اور اکتفا اور حرام سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنے کو صدق و تقویٰ کا معیار قرار دینے کے بجائے اللہ، آخرت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ مالی مدد، غلاموں اور قرضداروں کی گلو خلاصی کے لئے اپنے محبوب مال کو وقف کرنا، نماز، زکوٰۃ اور ایفائے عہد، مشکلات اور سختیوں پر صبر و ثبات (خصوصاً میدان جہاد میں جنگ کے دوران) جیسے اعمال کو اصل معیار سمجھنے کی ہدایت بھی اِسی حصے میں شامل ہے۔ اِس کے بعد قصاص کا حکم آتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ اِس پر نہ صرف یقین و ایمان رکھیں بلکہ اِسے زندگی کے تحفظ اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کا وسیلہ بھی سمجھیں۔ پھر وصیت کے اور روزہ کے احکامات شروع ہوتے ہیں اور روزہ کی بحث کے بیچ بیچ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ناحق لوگوں کا مال کھانے اور حکام کو رشوت دینے سے بچیں۔ اِس کے بعد قتال اور راہِ خدا میں جنگ کرنے کے بارے میں ابتدائی اور مقدماتی رہنمائیاں اور احکام بیان کئے گئے ہیں پھر حج اور عمرے کے احکام دیئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ حتیٰ کہ تمہاری زندگی کا کوئی ایک بھی حصہ اسلام سے باہر نہ رہنے پائے۔ پھر انفاق کا حکم، اُس کے

تناظر میں ایک مرتبہ پھر اللہ کی راہ میں قتال کے بارے میں مزید ہدایات، ہجرت اور مجاہد کے فضائل کی نشاندہی، شراب اور جوئے کی حرمت، یتیموں کے مال کی حفاظت کا اہتمام نیز نکاح، مہر، طلاق، عدت، رضاعت اور خانگی زندگی کے متعدد دوسرے مسائل کے بارے میں مفصل اور دقیق احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اِن کے بعد ایک مرتبہ پھر قتال کے بارے میں اور اُس کی سربراہی اور سرکردگی کے امور سے متعلق (تفصیل سے) تاریخی مثالیں دے کر وضاحت کی گئی ہے۔ اِس کے بعد اللہ کی راہ میں انفاق کی مفصل بحث، سود کی حرمت کا حکم اور اُس کے خراب نتائج کا ذکر اور احکام کے اِس سلسلے کے آخر میں قرض کے لین دین کے بارے میں جامع احکام بیان کئے گئے ہیں۔

جن تین جامع آیات پر اِس سورت کا اختتام ہوتا ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے:

- آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ بہر حال اُن کا حساب تم سے لے گا۔ جس کے لئے چاہے گا معاف کر دے گا اور جن کو چاہے گا، عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔
- پیغمبر اور مومنین اُس چیز پر یقین رکھتے ہیں جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ہے۔ وہ سب اللہ پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی میں فرق روا نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ہم نے سنا اور اطاعت کی، تم سے بخشش اور معافی کے طلب گار ہیں اور ہمیں تمہاری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔
- آخری آیت تمام سورت کا خلاصہ ہے اُس کے تین فقرے سورت کے تین حصوں کے لئے بمنزلہ عنوانات ہیں۔ "اللہ کسی کو اُس کی صلاحیتوں سے زیادہ کا مکلف نہیں ٹھہراتا" پہلے حصے کا عنوان ہے۔ "اُس کے لئے اُس کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہے اور اُس کے اوپر اُس کی اپنی کمائی کا وبال" دوسرے حصے کا عنوان ہے جبکہ درج ذیل آخری فقرہ جو چند دعاؤں کی صورت میں آیا ہے، اُن تمام احکامات کے لئے عنوان ہے جو تیسرے حصے میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے کہ: اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور بھول چوک پر ہماری گرفت نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر ویسا بھاری بوجھ نہ ڈال جو تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم طاقت نہیں رکھتے، ہمارے (گناہوں) سے درگزر فرما اور ہمیں معاف کر دے۔ ہم پر رحم فرما، تُو ہی ہمارا مولیٰ ہے؛ پس کافروں پر ہمیں غالب فرما۔

بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

الٓمٓ ﴿١﴾ ذَٰلِكَ ٱلْكِتَٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٢﴾

(۱)۔ا۔ل۔م۔(۲) یہ وہی کتاب ہے، اِس میں شک نہیں ہے، متقین کے لئے ہدایت ہے۔

(۱)۔ یہ سورت (ا۔ل۔م) کے تین حروف سے شروع ہوتی ہے، اِن کے بارے میں مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رکھیں:

- قرآن کی ۲۹ سورتیں اِسی طرح حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔
- اِن حروف کی تفسیر میں پیغمبر علیہ السلام سے کوئی روایت بیان نہیں کی گئی، صحابہؓ میں سے بھی کسی نے آپؐ سے اِس بارے میں دریافت نہیں کیا ہے۔
- صحابہ کی طرف منسوب آراء بھی؛ مختلف بھی ہیں اور اُن کی اسناد پر اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں، اس لئے مفسرین بھی اُن کے بارے میں مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی صحیح حدیث یا ثقہ (مستند) روایت ہوتی تو مفسرین مختلف رائے کبھی نہ دیتے۔
- زمانۂ جاہلیت کے ادب میں بھی اِس کے نمونے ملتے ہیں اور لکھنے والے اپنی بعض تحریریں اِسی قِسم کے حروف سے شروع کرتے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ہر کوئی اِس کے معنی جانتا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ اَسلوب متروک ہوتا گیا اور بعد میں آنے والوں کے لئے اِس کا مطلب سمجھنا مشکل ہوگیا۔
- اگر اِن حروف سے شروع ہونیوالی سورتوں کا بغور مطالعہ کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ اُن میں سے ہر سورت کے محوری اور مرکزی موضوعات کی تعداد اِن حروف کی تعداد کے متناسب ہے۔ ایک حرف سے شروع ہونیوالی سورت میں ایک ہی اساسی موضوع جب کہ دو اور تین حروف سے شروع ہونیوالی سورتوں میں دو اور تین موضوعات چھیڑے گئے ہیں۔ جہاں پر یہ حروف، حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق یعنی الف سے یاء تک آئے ہوئے ہیں تو موضوعات بھی ایک ترتیب کے ساتھ یعنی پہلے ایک اور پھر دوسرا چھیڑا گیا ہوتا ہے اور جہاں اِن میں ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہو تا مثلاً (ط، س، م) تو موضوعات بھی اُسی طرح ملے جلے (آپس میں گڈمڈ) اور ایک ساتھ چھیڑے گئے ہوتے ہیں۔ جہاں یہ ترتیب قائم رکھی گئی ہوتی ہے تو وہاں پر

موضوعات کا خلاصہ ایک ہی(آخری) آیت میں دیا گیا ہوتا ہے جبکہ بے ترتیب حروف مقطعات سے شروع ہونے والی سورتوں میں موضوعات کا خلاصہ آخری چند آیات میں دیا گیا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اِس سورت کے تعارف میں ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ سورت تین حصوں پر مشتمل ہے اور اُن کا خلاصہ آخری ایک آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)۔ اگرچہ اس کتاب کا مخاطب ہر کوئی ہے اور ہر ایک کے لئے حقائق بیان کرتی ہے، ہر شخص کے لئے اِس کو سمجھنا آسان بنایا گیا ہے اور اِسے انسانی فہم کی سطح تک نیچے اُتارا گیا ہے مگر اِس کی رہنمائیوں سے فائدہ اٹھانا کچھ مخصوص صفات کی موجودگی کا متقاضی ہے۔ جس شخص میں وہ مخصوص صفات ناپید ہوتی ہیں وہ اِس کے ماننے سے بھی عاجز رہ جاتا ہے اور اِس کی رہنمائیوں پر عمل کرنے سے بھی۔ اِس آیت میں لفظِ "تقویٰ" میں یہ ساری صفات خلاصہ کی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ "ہدایت ہے متقین کے لئے"۔ بعد والی آیات میں اِس کی شرح اور تفصیل اس طرح آئی ہے کہ اگرچہ اُن کو متقین (پرہیز کرنے والے) کہا گیا ہے مگر اُن کی ایجابی خصوصیات بیان کی گئی ہیں نہ کہ وہ جن سے وہ پرہیز کرتے ہیں اور اُس کے نتیجے میں اُن کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ قرآن اُن کا رہنما بن جاتا ہے۔ یہ متقین وہ لوگ ہیں جو صرف حاضر، اپنے سامنے مبرھن اور آنکھوں سے نظر آنے والی چیزوں ہی کو ماننے اور اُن کے علاوہ دوسری چیزوں کا انکار کرنے والے نہیں ہوتے۔ اُن رابطوں اور رشتوں کو قطع کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن کا تقاضا اُن کی انسانی فطرت کرتی ہے۔ یہ رابطے چاہے اُن کے اور اللہ کے درمیان تعلق کے حوالے سے ہوں یا انسانوں کے آپس میں یا پھر انسان اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے درمیان۔ بُخل سے مجتنب رہتے ہیں، تعصب سے دور رہتے ہیں، اِس دنیا کو ابدی اور دائمی نہیں سمجھتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ دنیا نہ تو ہمیشہ سے موجود ہے اور نہ ہی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ٱلَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِٱلۡغَيۡبِ وَيُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ ۝٣

(۳)۔ وہ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنہیں عطا کیا ہے اُس میں سے انفاق کرتے ہیں (اور ہماری عطا میں سے انفاق کرتے ہیں)

(۳)۔ اس مبارک آیت میں اِن متقین کی تین صفات کی نشاندہی کی گئی ہے:

- وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں سے اُوجھل اور اُن کے حواس وادراک سے باہر بھی کچھ موجود ہے، کوتاہ بین نہیں ہوتے اور صرف اپنی آنکھوں، احساس اور ادراک کو موجود کے لئے معیار اور کسوٹی نہیں قرار دیتے۔ یعنی وہ یہ حقیت مانتے ہیں کہ اُن کی محدود اور ظاہر بین نگاہ سے پرے بھی کچھ موجود ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنی آنکھوں اور حواس کو وجود کے لئے معیار اور کسوٹی قرار دیتے ہیں وہ اِس کتاب کی رہنمائیوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ قرآن بنی اسرائیل کی تاریخ

سے اِس کا نمونہ پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ: اُن کی اِسی بیماری کی وجہ سے اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ جب تک ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو صاف دیکھ نہ لیں ایمان نہیں لائیں گے۔

- اُن رابطوں اور رشتوں کو استوار رکھنے پر یقین رکھتے ہیں جن کا تقاضا اُن کی انسانی فطرت کرتی ہے چاہے وہ خالق کے ساتھ ہوں یا اُن کے اپنے ہم نوع کے ساتھ۔ اُن لوگوں کی طرح نہیں ہوتے جن کا تعارف اللہ تعالیٰ اسی سورت میں اِس طرح کرتا ہے کہ: وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ... یہ مطلب سورۃ الرعد میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے

.... إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُواْ ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿١٩﴾ ٱلَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ ٱللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ ٱلْمِيثَٰقَ ﴿٢٠﴾ وَٱلَّذِينَ يَصِلُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوٓءَ ٱلْحِسَابِ ﴿٢١﴾

.... صرف عقلمند لوگ نصیحت پکڑتے ہیں، وہ جو اللہ کے ساتھ عہد کو وفا کرتے ہیں اور اُس کے بندھنوں کو نہیں توڑتے اور اُن چیزوں کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں اور بُرے حساب سے تشویش میں رہتے ہیں۔

- یہ کتاب قدم قدم پر قربانی کے لئے بُلاتی ہے۔ وہی شخص اِسے مان سکتا ہے جو قربانی کے لئے کمربستہ ہو، طماع، حریص اور بخیل نہ ہو بلکہ تیار ہو کہ اپنی پونجی اللہ کی راہ میں کسی بے کس انسان کی دست گیری کے لئے یا کسی مقدس اور پاکیزہ ہدف کے حصول کے لئے وقف کرے۔

وَٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِٱلْءَاخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿٤﴾

(۴)۔ اور اُس (کتاب) پر جو تم پر نازل کی گئی ہے ایمان لاتے ہیں اور جو تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں (اُن پر بھی) اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

---

(۴)۔ یہاں پر اِن متقین کی دو اور انفرادیتیں بتائی گئی ہیں۔

- ایک یہ کہ وہ کسی خاص مذہب اور فکر کے لئے تعصب نہیں رکھتے، حق اور حقیقت کے سامنے سپر انداز ہونے والے ہوتے ہیں چاہے وہ اُن کے اعتقادات کے خلاف ہو اور اُن کے دشمن کی طرف سے پیش کی گئی ہو۔ بنی اسرائیل کی طرح نہ ہوں جو کہا

کرتے تھے: کہ ہم صرف اپنے باپ دادا سے میراث میں آئے ہوئے مذہب کو مانتے ہیں اور صرف اُسی چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اور ہمارے باپ دادا پر نازل ہوئی ہے، لیکن اگر کسی دوسرے پر نازل ہو جائے تو اُس پر ایمان نہیں لاتے۔

- دوسری یہ کہ وہ اِس دنیا کو ابدی اور ہمیشہ کے لئے قائم و دائم نہیں مانتے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ دنیا نہ تو ہمیشہ سے تھی اور نہ ہی ہمیشہ آباد رہے گی۔ جس طرح ایک وقت ایسا تھا کہ یہ دنیا موجود نہیں تھی اور پھر وجود میں آگئی، اُسی طرح یہ اپنے وقت پر ختم ہو جائے گی اور اُس کے بعد ایک اور دنیا وجود میں آجائے گی۔ دنیا پرست اور وہ لوگ جو سب کچھ اِسی دنیا میں سموتے ہیں اِس کتاب پر ایمان لانے سے عاجز ہیں۔

أُوْلَـٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾

(۵)۔ یہ اپنے رب کی رہنمائی میں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب ہیں۔

---

(۵)۔ اِنہی لوگوں کے لئے اللہ ہدایت کے دروازے کھولتا ہے اور اِن کی رہنمائی کرتا ہے۔ اللہ کی یہ کتاب اُن کی رہنما بن جاتی ہے اور وہ دنیا اور عقبیٰ کی سعادت اور کامرانی سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰٓ أَبْصَـٰرِهِمْ غِشَـٰوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾

(۶)۔ یقیناً وہ جو کافر ہوئے ہیں، اُن کے لئے برابر ہے چاہے اُن کو خبردار کرو یا نہ کرو، وہ ایمان نہیں لاتے۔ (۷) اللہ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہوئی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور اُن کے لئے عظیم عذاب ہے۔

---

(۶)۔ جن میں درج بالا صفات نہیں پائی جاتیں، غیبی چیزیں (حقیقتیں) نہیں مانتے، نماز قائم کرنے پر اعتقاد نہیں رکھتے، بخیل اور حریص ہوتے ہیں، انفاق پر تیار نہیں ہوتے، متعصب ہوتے ہیں، موجودہ دنیا کے اختتام اور انتہاء کا یقین نہیں رکھتے تو وہ اِس کتاب پر ایمان لانے کے قابل نہیں ہیں۔ اُن میں یہ ظرف اور استعداد ہوتی ہی نہیں کہ اِس کتاب کی رہنمائیوں سے فائدہ اُٹھائیں، تم اپنا وقت ایسے لوگوں کے قانع کرنے پر ضائع نہ کرو۔ اِن کی بجائے اُن لوگوں پر توجہ دو جن میں حق کے لئے پیاس

اور تڑپ نظر آئے۔ اِسی سورت کے ۵۵، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۹۱، ۹۶، ۱۷۰، ۱۷۷ اور متعدد دیگر مقامات پر آپ دیکھ لیں گے کہ بنی اسرائیل اپنی اِنہی خصلتوں کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو گئے۔

(۷)۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ پھر ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ انسان اُس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے ہدایت پانے کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور ہدایت کے ذرائع ناپید اور راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اُس کا دل سخت ہو جاتا ہے، نصیحت سے اثر پذیر ہونے کی استعداد کُند اور بصیرت ختم ہو جاتی ہے، نہ حق کے آگے سپر انداز ہوتا ہے اور نہ ہی نصیحت کا اثر قبول کرتا ہے؛ وہ نہ تو حوادث سے سبق لیتا ہے اور نہ ہی عبرتناک مناظر دیکھنے سے متاثر ہوتا ہے۔ ایسا شخص نہ خود حق کی پہچان کی صلاحیت رکھتا ہے، نہ دوسروں کی سنتا ہے اور نہ ہی چاروں طرف پھیلی ہوئی نشانیوں کی مدد سے اُسے پہچان سکتا ہے۔ یہ وہ صورتحال ہے جو خود اُس کے اپنے گناہوں سے جنم لیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ کسی کو ایسی صورتحال سے دوچار کرے جس کا مستحق وہ اپنے آپ کو ثابت نہ کر دے۔ درج ذیل حدیث مبارک سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح انسان کا دل نیک اور بد عمل سے متاثر ہوتا ہے۔

قال حذيفة: سمعت رسول الله يقول: تعرض الفتن على القلوب كالحصير وداعوا فاى قلب اشربها نكت فيه نكته سوداءُ. واى قلب انكرها نكت فيه نكته بيضاءُ حتى تصير على قلبين، على ابيض مثل الصفا. فلا تضره فتنه ما دامت السماوات والارض. والاخر اسود مربادا كالكوز مجخيا لا يعرف معروفا ولا ينكر منكرا. الا ما اشرب من هواه. رواه مسلم

حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ وہ فرما رہے تھے۔ فتنے دلوں پر اِس طرح چھاتے ہیں جیسے چٹائی کے اوپر تلے بُنی ہوئی پٹیاں، تو جو دل اُن سے سیراب ہو جاتا ہے اُس پر ایک کالا دھبہ پڑ جاتا ہے اور جو دل اُن سے اِبا کرتا ہے اس پر سفید دھبہ آجاتا ہے تا آنکہ یہ دل دو قسم کے ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک سفید بُراق جیسے سفید پتھر، تو جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں کوئی فتنہ اُسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور دوسرا کالا سیاہ جیسے کوئی کالا پتھر ہوتا ہے، یا اُلٹا رکھا ہوا پانی کا برتن (جس میں کچھ داخل نہیں ہو سکتا)۔ نہ وہ نیکی کو نیکی سمجھتا ہے اور نہ بُرائی کو بُرائی، اپنی ہویٰ (خواہش) و ہوس کے علاوہ کسی چیز کو دل میں راہ نہیں دیتا۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَبِٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَمَا هُم بِمُؤۡمِنِينَ ﴿٨﴾

(۸)۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

(۸)۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتے اور بہت سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ مومن ہیں مگر مومن نہیں ہوتے جبکہ بعض ایسے ہیں کہ آپ اُن پر اُن کی ظاہری وضع قطع اور لباس و حلیے سے مسلمان کا گمان کرتے ہیں مگر وہ مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ اس لئے کہ مسلمان ہونا نہ تو مسلمانی کے دعوے پر منحصر ہے نہ خواہش و تمنا پر اور نہ ہی لباس اور عباء و قباء پر لیس الایمان باالتمنی و لا بالتحلی و لکن ہو ما و قرنی القلب و صدقه العمل: ایمان نہ تمنا کا نام ہے نہ حلیے اور ظاہری لباس کا، بلکہ یہ وہ کچھ ہے جو دل میں قرار پاتا ہے اور عمل اُس کی تصدیق کرتا اور اُس کے وجود کی شہادت دیتا ہے۔

يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَمَا يَخۡدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُونَ ﴿٩﴾ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ ٱللَّهُ مَرَضًاۖ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمُۢ بِمَا كَانُواْ يَكۡذِبُونَ ﴿١٠﴾

(۹)۔ وہ اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے، دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے علاوہ کسی کو دھوکے میں نہیں ڈال سکتے مگر وہ جانتے نہیں۔ (۱۰) اُن کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے اُن کا مرض بڑھا دیا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

(۹)۔ یہ لوگ دھوکا کر رہے ہیں، اللہ کے ساتھ بھی، مومنوں کے ساتھ بھی اور اپنے ساتھ بھی مگر اپنے علاوہ دوسروں کو دھوکے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ اپنے ہر گناہ کے لئے مذہبی توجیہہ اور شرعی حیلے تراشتے ہیں، یہ اللہ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ مومنوں کے ساتھ بھی دھوکا کرتے ہیں، اُن کے سامنے ایمان اور اخلاص کی ڈینگیں مارتے ہیں مگر جھوٹ موٹ اور اُن کو ورغلانے کے لئے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس قسم کی چالیں چل کر یہ صرف اپنے آپ کو اور اپنی طرح کے دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہیں، اللہ کو اور مومنوں کو نہیں۔ یہ اگر دھوکے سے منزل پر پہنچنے کی توقع کر رہے ہیں تو جان لو کہ بھولے ہیں اور عقل و شعور سے عاری ہیں۔

(۱۰)۔ اِن کے دل بیمار اور زبانیں جھوٹی ہیں اور یہی اِن کے نفاق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اِن کی نفاق کی بیماری دن بدن بڑھتی جائے گی تا آنکہ دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ دنیا میں ہمیشہ خوف اور اضطراب کی حالت میں زندگی

بسر کریں گے، مسلمانوں کی اقبال مندی اور بالا دستی اِن کو شاق گزرے گی اور آخرت میں دوزخ کی سب سے گہری کھائی اور سب سے زیادہ عذاب اِن کے حصے میں آئے گا۔

اِس مبارک آیت سے پتہ چلتاہے کہ نفاق کی سب سے بڑی نشانی جھوٹ بولناہے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں: منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جس کسی میں یہ تینوں موجود ہوں وہ مکمل منافق ہے اور جس میں کوئی ایک موجود ہو اُس میں نفاق کی ایک نشانی موجود ہے، چاہے وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے ایمان کے بارے میں مطمئن ہو۔ وہ تین نشانیاں یہ ہیں کہ:

- جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
- جب وعدہ کرے تو توڑ دے۔
- اور اگر امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ قَالُوٓا۟ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلْمُفْسِدُونَ وَلَـٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

(۱۱)۔جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر تباہی اور فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو یقیناً مصلحین ہیں۔ (۱۲) خبردار! یہی ہیں جو مفسد ہیں مگر یہ جانتے نہیں۔

---

(۱۱)۔ یہ دُشمن کے ساتھ اپنے چھپے اور کُھلے رابطوں کی توجیہہ یوں کرتے ہیں جیسے کہ صلح صفائی کے لئے بھاگ دوڑ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ضرورت کے طور پر رکھے جا رہے ہوں۔ ظاہر یوں کرتے ہیں جیسے اُن مصلحین کا کردار ادا کر رہے ہیں جو لڑائی جھگڑے پسند نہیں کرتے بلکہ اُن کی روک تھام کرتے ہیں اور صلح صفائی کی کوئی صورت نکالنے میں جُتے رہتے ہیں۔

(۱۲)۔ حقیقت میں یہی مفسدین ہیں اور فساد کا زبردست آلہِ کار ہیں۔ خود مسلمانوں کے اندر فساد پیدا کرنے کے عامل بھی یہی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ہر لشکر کشی کے اصل عامل بھی یہی ہیں۔ یہی منافقین ہیں جو دشمنوں کو حملے پر اُکساتے ہیں، دشمن ہر چیز سے زیادہ اور سب سے پہلے اپنے حملوں کے لئے اِنہی منافقین پر انحصار کرتا ہے۔ اُن کو اطلاعات یہ فراہم کرتے ہیں،

مسلمانوں کی صفوں میں اختلافات یہی ابھارتے ہیں اور استقامت اور ثابت قدمی کے مخالف رویئے کو ہوا بھی یہی دیتے ہیں۔ اگر یہ منافقین نہ ہوتے تو نہ تو دشمن مسلمانوں پر حملے کرنے میں اتنے جری ہوتے اور نہ ہی کوئی معرکہ سر کرنے میں کامیاب ہوتے۔ یہ لوگ اپنا کراہت انگیز کردار، صلح جوئی اور مصلحت پسندی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ درپردہ مسلمانوں اور حقیقی صلح کے خلاف وہ کچھ کر رہے ہیں جن کے کرنے سے کُھلا دشمن عاجز ہوتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُواْ كَمَآ ءَامَنَ ٱلنَّاسُ قَالُوٓاْ أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلسُّفَهَآءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

(۱۳)۔ اور جب اِن کو کہا جاتا ہے کہ اِن (دوسرے) لوگوں کی طرح کا ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں: کیا اِن بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ خبردار یہ خود بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔

---

(۱۳)۔ جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُن مومنوں کی طرح ہو جاؤ جو مخلص ہیں، دشمنوں کے ساتھ چھپے رابطے رکھتے ہیں اور نہ ہی کھلے۔ جو اللہ کی راہ میں قربانیاں دیتے ہیں اور مشکلات اور سختیاں برداشت کرتے ہیں تو اُن کا جواب ہوتا ہے: آپ چاہتے ہیں کہ ہم اِن کم عقلوں کی طرح ہو جائیں؟ ہمیشہ اور تاریخ کے ہر پڑاؤ پر آپ مشاہدہ کریں گے کہ منافقین اپنے آپ کو مُصلح اور روشن خیال (enlightened moderate) کہتے ہیں اور مخلص مومنین کو شدت پسند، کم عقل اور ناسمجھ قرار دیتے ہیں۔ اُن کی سمجھ کے مطابق یہ انتہائی بے وقوفی ہے کہ خطروں میں کُودا جائے، کسی مقدس ہدف اور دینی ارمان (مقصد) کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی دی جائے، مشکلات، اور تکلیفیں برداشت کی جائیں، دوسروں کی راحت اور آرام کے لئے اپنی راحت اور آرام کو دفن کیا جائے اور اپنی جان اور آسائش کو خطرے میں ڈالا جائے۔ اُن کے معیارات کے مطابق وہ لوگ بھی بے عقل اور ناسمجھ ہیں جو داؤپیچ نہیں جانتے، ہر ایک سے صدق کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، اصولوں کی پاس داری کرتے ہیں، اپنی دوستی اور دشمنی کا تعین اغراض کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصولوں اور ضوابط کی روشنی میں کرتے ہیں، اپنے عہد کو وفا کرتے ہیں اور اپنی بات پر قائم رہتے ہیں۔ اُن کی دانست میں عقلمند وہی ہے جو ہر کام میں اور ہر کسی سے معاملہ کرتے وقت اپنے فائدے پر نظر رکھے، نفع کی خاطر ہر کام جائز سمجھے، اخلاص، ہمت، مردانگی اور ایثار کے نام پر اپنے فائدے کو خطرے میں نہ ڈالے۔ شہید، زخمی، قیدی، مہاجر اور مورچے میں ڈٹا ہوا مجاہد، اُن کی نگاہ میں انتہائی ناسمجھ اور نافہم لوگ ہوتے ہیں۔ جب اُن کو کہا جاتا ہے کہ

تم بھی اُن کی مانند اخلاص کا ثبوت دو، اپنے ایمان کو اُن کی طرح کر لو تو کہتے ہیں: کیا ہم اِن پاگل بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔

وَإِذَا لَقُوا۟ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوْا۟ إِلَىٰ شَيَـٰطِينِهِمْ قَالُوٓا۟ إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴿١٤﴾ ٱللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِى طُغْيَـٰنِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

(۱۴)۔ اور جب ایمان والوں سے اِن کا سامنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں مگر جب اپنے شیطانوں کے ساتھ علیٰحدگی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم یقیناً تمہارے ساتھی ہیں اُن کے ساتھ تو ہم صرف مذاق کر رہے ہیں۔ (۱۵) اللہ اِن کے ساتھ استہزاء کر رہا ہے اور اِن کی سرکشی میں ان کو مہلت دیئے جا رہا ہے، حال یہ ہے کہ یہ اپنی سرکشی میں اندھے ہو رہے ہیں۔

(۱۴۔۱۵) یہ مسلسل چہرے بدلتے رہتے ہیں جس گروہ میں جانکلتے ہیں اُن کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر ایک سے دوستی اور ساتھ دینے کی باتیں کرتے ہیں مگر حقیقت میں نہ کسی کے دوست ہوتے نہ ساتھ دینے والے بلکہ اپنی غرض کے غلام ہوتے ہیں۔ مومنوں کی بالادستی کے وقت اُن کے پاس سمٹ آتے ہیں اور تاکید کر کے کہتے ہیں کہ: ہم بھی ایمان والے ہیں مگر جب کفر کے دستے کے شیطان صفت سرداروں سے علیٰحدگی میں ملتے ہیں تو اُن کو اپنی بے ایمانی اور کفر پر قائم رہنے کا اطمینان دلاتے ہیں بلکہ مومنین کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو اُن کے اوپر استہزاء قرار دیتے ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ اِس طرح ممکن ہے وہ دونوں فریقوں کو دھوکہ دے پائیں اور دونوں سے امتیازات بٹور سکیں مگر در حقیقت اللہ تعالیٰ اِن کو اِن کے اِس منافقانہ طرزِ عمل کی مناسب اور قرار واقعی جزا دیتا ہے، وہ یوں کہ کوئی بھی اِن پر یقین نہیں رکھتا اور اِن کو دوست نہیں سمجھتا۔ ہر کوئی اِن کو ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھتا ہے۔

أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُا۟ ٱلضَّلَـٰلَةَ بِٱلْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَـٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوا۟ مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

(۱۶)۔ یہ وہی گروہ ہے جنہوں نے ضلالت کو ہدایت کے عوض خرید لیا ہے۔ مگر نہ تو اُن کی اِس تجارت نے نفع پہنچایا اور نہ وہ ہدایت یاب ہوئے۔

(۱۶)۔ یہ ایمان کا سودا کرتے ہیں۔ ایمان اور اعتقاد کے بارے میں بھی اِن کا رویہ ایک بازاری تاجر کا سا ہوتا ہے مگر مطمئن رہیں یہ نہ اپنی تجارت سے کوئی منافع کما سکیں گے اور نہ اپنی غرض حاصل کرنے کی کوئی راہ پا سکیں گے۔ ہمیشہ اپنے نفاق اور ضلالت میں مضطرب اور پریشان حال رہیں گے۔

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ ٱلَّذِى ٱسۡتَوۡقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهُۥ ذَهَبَ ٱللَّهُ بِنُورِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِى ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبۡصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُونَ ﴿١٨﴾

(۱۷) اِن کی مثال اُن لوگوں کی مانند ہے جنہوں نے آگ روشن کرلی مگر جب اُن کا ماحول روشن ہوا، اللہ نے اُن کا نور (بصیرت) سلب کرلیا اور اُن کو ایسے اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ اُن کو کچھ نہیں سوجھتا۔ (۱۸) بہرے، گونگے اور اندھے، پس وہ دوبارہ پلٹ نہیں سکتے۔

(۱۷،۱۸)۔ اِس مثال میں منافقین کے ایک گروہ کو اُن لوگوں کے مصداق بتایا گیا ہے جو اندھیرے میں جارہے ہوں اور اچانک کوئی اُن کے راستے میں آگ روشن کرلے۔ جب یہ آگ اُن کے ارد گرد کے ماحول کو روشن کر دیتی ہے اور اُن کو نظر آنے لگتا ہے تو بجائے اِس کے کہ یہ روشنی اُن کی رہنما بن جائے اور اِس کی مدد سے وہ لوگ اپنا راستہ تلاش کرلیں، یہ روشنی اُن کی آنکھوں کا نور سلب کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ روشنی کو دیکھ لیتے ہیں مگر اُس سے فائدہ اٹھانا تو کیا بلکہ اُن کی اپنی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ جو تھوڑی بہت روشنی آنکھوں میں پہلے سے موجود تھی وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی آنکھوں کی روشنی ختم کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے کہ بیمار آنکھیں روشنی میں چندھیا جاتی ہیں۔ مگر یہ وہ اندھے ہیں جو صرف اندھے ہی نہیں بلکہ دوسروں کی آواز سننے سے بھی قاصر ہیں اور راستہ پوچھنے کے لئے زبان بھی نہیں رکھتے۔

اِس مثال کے بارے میں چند نکات ذہن میں رکھ لیں۔

- ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِ هِمْ سے مراد اُن کی آنکھوں کی روشنی ختم کرنا ہے۔ آیت کے آخری حصے میں (عمیٰ) کا ذکر اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اِس کے بعد والی مثال میں (وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِ هِمْ: اگر اللہ چاہتا تو اِن کی سماعت اور بینائی ختم کر دیتا) سے بھی اسی مطلب کی تصدیق ہوتی ہے۔ (لَا يَرْجِعُوْنَ) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گروہ اندھا ہو جانے کے بعد آگ کی طرف لپکتا ہے۔ نہ خود راستہ دیکھ سکتے ہیں تاکہ آگ میں گرنے سے اپنے آپ کو بچا لیں نہ کسی دوسرے کی آواز سنتے ہیں اور نہ دوسروں کو آواز دے سکتے ہیں اِس لئے کہ اندھے، بہرے اور گونگے بھی ہیں۔ پتنگوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں۔ درج ذیل حدیث جو بخاری، مسلم اور ترمذی میں بیان ہوئی ہے، سے معلوم ہوتا

ہے کہ اِس مثال کی یہی تشریح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ حدیث یوں ہے: عن ابي هريرةَ رضى الله تعالىٰ عنه أنه سمع رسولَ الله صلى الله عليه و سلم يقول: انما مثلَي و مَثلُ الناس كمثل رجل استوقد ناراً، فلما أضاءت ماحوله جعل الفَراشُ وهذه الدوابُّ التى تقع في النار يقعنَ فيها، فجعلَ الرجلُ يزَعَهُنَ و يغلبنه فيقتحمنَ فيهافأنا آخذ بحُجزِكم عن النارو أنتم تقتخمون فيها۔

میری اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آگ روشن کرے مگر جب اُس کا گرد و پیش روشن ہو جائے تو پتنگے اور وہ حشرات جو آگ کی طرف لپکتے ہیں، اُس میں گرنے لگتے ہیں۔ یہ شخص اُن کو روکتا ہے مگر وہ غالب آتے ہیں اور آگ میں گِرتے ہیں، میں بھی آپ کو پکڑ پکڑ کر آگ سے روکتا ہوں مگر آپ ہیں کہ اُس میں گرتے جاتے ہیں۔

تعجب ہے کہ اِن تصریحات کے باوجود بعض لوگ اِس آیت کی ایسی ایسی تعبیریں پیش کرتے ہیں جو اِس آیت سے بھی مطابقت نہیں رکھتیں اور اِس حدیث سے بھی مغائرت رکھتی ہیں۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمَٰتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ ٱلصَّوَٰعِقِ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ ۚ وَٱللَّهُ مُحِيطٌۢ بِٱلْكَٰفِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ ٱلْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَٰرَهُمْ ۖ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا۟ فِيهِ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا۟ ۚ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَٰرِهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

(١٩)۔ یا جیسے آسمان سے کوئی تیز بارش جس میں تاریکی، گرج اور چمک ہو، بجلی کی کڑک سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں خوف کے مارے موت کے ڈر سے، حالانکہ اللہ نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے۔ (٢٠) قریب ہے کہ چمک اُن کی آنکھیں اندھی کر دے، جب اُن پر روشنی کر دی جاتی ہے تو چل پڑتے ہیں اور جب اُن پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو اِن کی سماعت اور بینائی ختم کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(١٩-٢٠)۔ دوسری مثال میں منافقین کے گروہ کی مشابہت اُن لوگوں سے کی گئی ہے جو ایک ایسی اندھیری رات میں سفر کر رہے ہوں جس میں تیز بارش برس رہی ہو بجلی کی چمک کے ساتھ تیز گرج اور کڑک کی آوازیں آرہی ہوں اور بجلی گر رہی ہو۔ یہ گم کردہ راہ لوگ بجلی کی چمک میں چند قدم چل لیتے ہیں مگر اِس خوف سے کہ بجلی اُنہی پر نہ آگرے اور زندگی کی شام نہ ہو جائے، یہ موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ منافقین اِسی طرح ہیں جب اِن کو اسلام کی گود میں کوئی

دنیوی منفعت نظر آجاتی ہے تو اسلام کی طرف بڑھ آتے ہیں مگر جب حالات مجہول ہو جاتے ہیں اور خطرہ محسوس کر لیتے ہیں تو اُسی جگہ ٹھہر جاتے ہیں اور رخ پھیر لیتے ہیں۔ موت سے بچنے کے لئے اِن کی تدبیریں ایسی ہیں جس طرح بجلی گرنے کے خوف سے کوئی کانوں میں انگلیاں ٹھوس لے حالانکہ اِس طرح نہ کوئی بجلی سے بچ سکتا ہے اور نہ موت سے۔ اِن کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ زندگی اور موت کا فیصلہ اللہ صادر کرتا ہے اور اپنی منافقانہ تدبیروں سے وہ موت کو ٹال نہیں سکتے اِس لئے کہ اللہ کافروں اور اُن کی سب چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے کوئی چیز اللہ کی حکمرانی اور احاطے سے باہر نہیں ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

(۲۱)۔ اے لوگو! اپنے اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی، تاکہ پرہیزگار رہ سکو۔ (۲۲) وہ جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش اور آسمان کو چھت بنایا، آسمان سے پانی نازل کیا اور اُس کے ذریعے میوے اُگائے، تمہارے لئے روزی کے طور پر، تو اللہ کے ہم سر تلاش نہ کرو اِس حال میں کہ تم خوب جانتے ہو (کہ اُس کا ہم سر نہیں ہے)۔

(۲۱۔۲۲)۔ اُس ذات کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ وہ جس نے زمین و آسمان کو اِس طرح پیدا کیا اور اُن کے درمیان ایسی تنسیق اور وحدت قائم کی کہ اُن میں سے ایک آپ کے اِس گھر کے فرش اور دوسرا چھت کا کام دینے لگا۔ ایک سے پانی برساتا ہے اور دوسرے سے اُس پانی کے ذریعے آپ کے لئے پھل اور غلہ اُگاتا ہے اور آپ کی روزی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ نہ تو تمہاری پیدائش میں، نہ آسمان سے پانی برسانے میں اور نہ ہی زمین سے غلہ اور پھل اُگانے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا کوئی حصہ ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔

یہاں پر تین اور باتیں بھی قابلِ غور ہیں:

- زمین آپ کے گھر کا فرش ہے۔ یہ نہ تو پتھر کی طرح سخت بنائی گئی ہے اور نہ کیچڑ کی طرح نرم، نہ بہت گرم ہے اور نہ ہی بہت سرد، نہ اِس کے اندر دباؤ بہت زیادہ ہے نہ بہت کم اور آسمان اِس گھر کی چھت ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں آسمان کو چھت اور مضبوط سقف کے نام سے یاد کیا گیا ہے جبکہ انسان آج چودہ سو سال بعد یہ راز جان سکا ہے کہ اُس کی زمین کی فضاء میں ایسا انتظام موجود ہے جو اُسے ایک محفوظ آڑ اور سقف کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ چھت آپ کو سورج کی خطرناک

شعاعوں سے محفوظ رکھتی ہے اور شہاب ثاقب سے بھی جو نہایت سرعت کے ساتھ زمین کا رخ کرتے ہیں مگر اس سقف کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں ذرہ ذرہ ہو جاتے ہیں یا اپنا رُخ بدل دیتے ہیں۔ اگر کسی باضمیر سائنسدان کو کہہ دیا جائے کہ ہماری ایک کتاب میں جو چودہ سو سال قبل نازل ہوئی ہے کئی جگہ یہ بات آئی ہے کہ یہ آسمان آپ کی زمین کے لئے ایک مضبوط سقف اور چھت ہے مگر ایک وقت آئے گا کہ اس میں سوراخ اور دراڑیں پڑ جائیں گی یعنی وہی بات جو آج آپ زمین کی فضاء کو مضبوط سقف اور اوزون کی تہہ کو سورج کی مضر شعاعوں سے محفوظ رہنے کا وسیلہ کہہ کر کر رہے ہیں۔ اُسی پردہ یا چھت کے بارے میں جو آج کاربن ڈائی اکسائیڈ گیسوں کی زیادتی کی وجہ سے جگہ جگہ سے کھرُچا جا کر اور رگڑ کھا کر ٹوٹ پھوٹ اور شگاف پڑنے کا شکار ہو رہا ہے؛ مجھے سمجھائیں کہ اُس سائنسدان کا ردعمل کیا ہو گا؟ اِس دقیق علمی بیان اور پیشین گوئی کے بارے میں وہ کیا کہے گا؟ قرآن اور اُس کے لانے والے کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کرے گا؟ کیا اِس کے علاوہ کچھ اور کہنے کی مجال رکھتا ہے کہ یہ کسی انسان کی بات نہیں ہو سکتی، ایسی بات وہی ہستی کر سکتی ہے جو ہماری فضاء کے بہت سے رازوں کی امین ہو۔ قرآن میں اِس طرح کی باتوں سے استناد کر کے وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ اِس کتاب کی بھیجنے والی ذات کم از کم ایسی ضرور ہے جو زمین اور آسمانوں کے اسرار جانتی ہے۔

- اِسی طرح زمین و آسمان کے درمیان گہری یگانگت اور تنسیق بتاتی ہے کہ انسان اور زمین و آسمان کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ذات ایک ہی ہے۔ ایک سے پانی برساتی ہے اور اُسی پانی کے ذریعے دوسرے سے خوبصورت پودے، غلہ اور خوش ذائقہ پھل پیدا کرتی ہے جس سے وہ انسان کی ضرورتیں پوری کرتی ہے اور اُس کے رزق و روزی کا انتظام کرتی ہے۔ یہ یگانگت کس نے تخلیق کی اور کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم پکار اٹھیں کہ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔
- اللہ کی عبادت انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرتی ہے اور یہی تقویٰ انسان کے لئے اللہ کی کتاب کو سمجھنے کا دروازہ کھولتا ہے۔ آپ نے اِس سورت کی پہلی آیت میں دیکھ لیا کہ اللہ کی یہ کتاب متقین کے لئے رہنما ہے یعنی اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ کی کتاب آپ کی رہنما بن جائے اور آپ اُس کے اسرار جان لیں تو اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کریں اور یہ صفت عبادت کے راستے حاصل کی جا سکتی ہے۔ آیت کے سیاق وسباق سے اور بعد والی آیت سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتاب ہی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾

---

(۲۳)۔ اور اگر اُس چیز کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اللہ کے علاوہ اپنے شاہدوں کو بلاؤ اور اُس کی مانند ایک سورت تو بنالاؤ اگر تم سچے ہو۔

(۲۳)۔ انسان کی پیدائش اور اُس کے لئے رزق اور روزی کا انتظام کرنے کے بعد اُس پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اُس نے اُس کی رہنمائی کے لئے کتاب بھیج دی۔ ایک ایسی کتاب جس کی حقانیت کو ہر سلیم الفطرت انسان نہایت آسانی سے جان سکتا ہے اور اُس کے دقیق نکات اور گہری بحثوں سے بہت جلد اِس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ ہر سوال کا جواب فراہم کرتی اور ہر شک رفع کرتی ہے۔ اگر آپ کو اِس کتاب میں شک ہے اور گمان کر رہے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو اِس کی ایک چھوٹی سی سورت کے برابر کوئی چیز لے آؤ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہاں قرآن کے بلند پایہ اَدبی محاسن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مخالفین کو ایک ادبی مقابلے کی دعوت دے کر کہا گیا ہے کہ تم قرآن کی کسی چھوٹی سورت کی مانند اَدبی مقالہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ یہ درست ہے کہ قرآن ادبی لحاظ سے بھی ایک ایسا بڑا معجزہ ہے کہ کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر قرآن کا علمی اعجاز اِس سے بھی بڑا معجزہ ہے اور جو گہرے علمی مباحث انسان، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستاروں اور تمام عالم کے بارے میں اس میں موجود ہیں؛ کسی دوسری ذریعے سے جاننا ناممکن ہیں۔ وہ اسرار جو قرآن نے کھول دیئے ہیں، وہ ضوابط جو اِس میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی درستگی کے لئے وضع کئے گئے ہیں، اپنے عمیق اور جامع مطالب، حق و باطل، جائز و ناجائز، حلال و حرام کے بارے میں پیش کئے گئے گہرے عادلانہ معیارات اور متعدد دیگر پہلوؤں سے بھی قرآن ایک معجزہ ہے۔ یہ عرب شعراء اور ادیبوں کے علاوہ دوسری اقوام کے لئے بھی معجزہ ہے اور قیامت تک کے لئے ہے۔

فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ وَلَن تَفۡعَلُواْ فَٱتَّقُواْ ٱلنَّارَ ٱلَّتِي وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلۡحِجَارَةُۖ أُعِدَّتۡ لِلۡكَٰفِرِينَ ﴿٢٤﴾

(۲۴)۔ اور اگر اِس پر قادر نہ ہو سکو جو تم کبھی بھی نہیں ہو سکتے تو اُس آگ سے بچو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، کافروں کے لئے بھڑکائی گئی۔

(۲۴)۔ قرآن کے علمی اعجاز کا ایک نمونہ اِس آیت سے پہلے ذکر کیا گیا اور ایک اِسی آیت میں موجود ہے، یہ جو فرمایا جارہا ہے: کہ "اُس آگ سے بچیں جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے"؛ قرآن کے نزول کے زمانے میں کوئی بھی یہ بات نہیں مان

سکتا تھا کہ پتھر بھی آگ کے لئے ایندھن ہوسکتے ہیں۔ معلوم نہیں، مخالفین نے اُس وقت اِس بات پر کتنا تمسخر کیا ہو گا۔ کتنا اپنی مجالس میں کہا ہو گا کہ یہ دیوانے اب اِس بات کو بھی ماننے لگے ہیں کہ پتھر جلتے ہیں، کوئی عاقل انسان پتھروں کے جلنے پر کیسے یقین کر سکتا ہے؟ لیکن آج اگر کسی ماہر طبیعات سے پوچھا جائے کہ جناب کیا پتھر جلائے جاسکتے ہیں تو وہ بغیر کسی تامل کے فوری جواب دے دے گا کہ ہاں جلائے جاسکتے ہیں۔ صرف پتھر ہی نہیں بلکہ سب کچھ حتیٰ کہ لوہا بھی، ہر چیز آگ کے اونچے درجوں میں جل جاتی ہے؛ یہ پانی اور مٹی بھی جسے آپ آگ بجھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، جل جاتی ہیں۔ اور اگر پھر آپ یہ بھی بتا دیں کہ ہماری کتاب میں چودہ سو سال پہلے آیا ہے کہ پتھر آگ کا ایندھن ہوں گے، اُس وقت مخالفین ہماری کتاب کی اِس بات کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور اِسے ایک بڑا جھوٹ قرار دیتے تھے تو اُس ماہر طبیعات کا ردعمل کیا ہو گا؟ آپ کی اُس کتاب اور اُس کے پیش کرنے والے کے بارے میں اُس کی سوچ کیا ہو گی؟

وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أَنَّ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُۖ كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنۡهَا مِن ثَمَرَةٖ رِّزۡقٗا قَالُواْ هَٰذَا ٱلَّذِي رُزِقۡنَا مِن قَبۡلُۖ وَأُتُواْ بِهِۦ مُتَشَٰبِهٗاۖ وَلَهُمۡ فِيهَآ أَزۡوَٰجٞ مُّطَهَّرَةٞۖ وَهُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝٢٥

(۲۵)۔ اور اُن کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، خوشخبری دے دو کہ اُن کے لئے ایسی جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جب اُن کے پھلوں میں سے کچھ اِن کو کھلا دیا جائے گا تو کہہ اُٹھیں گے: یہ تو وہی ہے جو اِس سے پہلے بھی ہمیں عطا کیا گیا تھا (واقع یہ ہے کہ) اُنہیں آپس میں ملتے جُلتے (پھل) دیئے گئے ہوں گے اور وہاں پاکیزہ جوڑے اُن کو حاصل ہوں گے اور وہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔

---

(۲۵)۔ ایمان اور عمل صالح رکھنے والوں کو ایسی جنتوں کی خوشخبری سنا دو جن کے درختوں اور محلات کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن کے پھلوں کی ظاہری شکل وصورت ملتی جلتی ہو گی مگر ہر ایک لذت اور ذائقے میں پہلے سے اچھا اور بڑھ کر ہو گا۔ ایسے بے داغ، اور پاکیزہ جوڑے اُن کے حصے میں آئیں گے جو انسانی کمزوریوں اور اخلاقی ضعف و ناپسندیگی سے منزہ ہوں گے اور ہیشگی کی زندگی حاصل ہو گی۔ لہٰذا اگر آپ نے حلال رزق پر اکتفا کیا تو اُس کے بدلے میں جنت کے پھل ملیں گے، اگر گندے کاموں میں لتھڑنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا تو جنت کے بے داغ اور پاکیزہ جوڑے حاصل ہوں گے، اگر ایمان کے راستے میں اپنی مٹی کا گھروندہ قربان کیا تو اُس کے عوض جنت کے بنگلے اور محلات نصیب ہوں گے اور اگر اپنی چند روزہ زندگی قربان کر لی تو جنت کی دائمی زندگی حاصل ہو گی۔

۞ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسۡتَحۡيِۦٓ أَن يَضۡرِبَ مَثَلٗا مَّا بَعُوضَةٗ فَمَا فَوۡقَهَاۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ فَيَعۡلَمُونَ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡۖ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلٗاۘ يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرٗا وَيَهۡدِي بِهِۦ كَثِيرٗاۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِۦٓ إِلَّا ٱلۡفَٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾

(۲۶)۔ اللہ کو اِس میں عار نہیں ہے کہ کسی مچھر کی مثال دے دے یا اُس سے برتر کسی چیز کی۔ پس جو ایمان والے ہوتے ہیں سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے حق ہے اور وہ جو کافر ہوئے ہیں تو کہتے ہیں کہ: اللہ اِس مثال سے کیا قصد و ارادہ رکھتا ہے۔ گمراہ کر دیتا ہے اِس سے بہتوں کو اور بہتوں کو اِس سے ہدایت بخشتا ہے اور وہ فاسقوں کے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔

(۲۶)۔ یہ اللہ کا انتہائی لطف و کرم ہے کہ اُس نے انسان کو سمجھانے کے لئے مچھر کی مانند چھوٹی چیز سے لے کر سورج اور آسمان کی مانند عظیم الجثہ اور بالاتر چیزوں کی مثالیں بیان کر دی ہیں۔ قرآن کو انسان کے فہم کی سطح تک (نازل) نیچے لا کر اُتار دیا ہے۔ ایمان والے اِسے سمجھتے ہیں، جو کوئی بھی ایمان کی روشنی میں اِس کی دی گئی مثالوں پر غور کرتا ہے بہت جلد ہی اِس کے مقصد اور ہدف کو جان لیتا ہے مگر کافر اِس کے مقصد کو جاننے سے قاصر ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق چھوٹی چیزوں کا ذکر بزرگ و بالا اللہ کی شان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اِس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ ایک چھوٹی زندہ مخلوق پیدا کرنا ایک بڑے جاندار کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے، اِس میں زیادہ بڑی نزاکت اور لطافت سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسانوں نے بھی جو ریڈیو، ٹیلی وژن اور کمپیوٹر بنائے، شروع شروع میں بڑے ہی بنائے، مگر جتنی جتنی پیش رفت کرتے گئے اُن کا حجم چھوٹے سے چھوٹا ہوتا گیا۔ چند سال پیشتر کے وہ ریڈیو اور کمپیوٹر جو ایک اکیلا شخص اُٹھا نہیں سکتا تھا آج تمہاری قمیص کی جیب میں سما جاتے ہیں۔

ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهۡدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مِيثَٰقِهِۦ وَيَقۡطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡخَٰسِرُونَ ﴿٢٧﴾

(۲۷)۔ وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن کے (جوڑنے) استوار رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اُنہیں قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یہی ہیں جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

(۲۷)۔اِس آیت سے نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ فطری رابطے اور رشتے،وہ رشتے جن کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اُن کا قطع کرنا اُن فاسق لوگوں کا کام ہے جو الٰہی ہدایت اور رہنمائی سے محروم ہیں اور وہی جن کے نصیب میں اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کی سعادت نہیں ہے۔ یہ وہی مطلب ہے جو سورت کی ابتداء میں (اقامتِ صلواۃ سے) بیان کیا گیا ہے، نماز در حقیقت اقامت الصلوۃ کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ یہ انسان اور اللہ کے درمیان اور خود انسانوں کا آپس میں بھی رشتے اور رابطے مضبوط کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے، اسی لئے نماز کی ادائیگی کے لئے اللہ تعالیٰ اقیموا الصلوۃ کے صیغے کا انتخاب کرتا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

(۲۸)۔ کس طرح اللہ کا کفر کرتے ہو! حالانکہ تم مردہ تھے مگر اُس نے تمہیں زندہ کر دیا، پھر تمہیں مار کر دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر اُسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔ (۲۹) وہی ذات ہے جس نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کر دیں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو اُنہیں سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

(۲۸)۔ اللہ کا انکار نہایت تعجب کی بات ہے سمجھ نہیں آتی کہ انسان کس طرح اپنی عقل اور دل کو اِس پر قانع کر سکتا ہے؟ کس نے بے جان مٹی سے اِسے پیدا کیا؟ اِس کی زندگی سے وابستہ یہ صفات اِسے کس نے ودیعت کیں، اِس کو علم کس علیم نے دیا، آنکھیں کس بصیر نے دیں، سماعت کس سمیع نے، بولنے کی توفیق کس نے عطا کی اور حافظے کی استعداد اِس میں کس نے رکھی؟ مجھے کوئی ایسا مصنوع و مخلوق دکھا دو جس میں دور سے اپنے صانع اور خالق کے ہاتھ کی نشانیاں نظر نہ آتی ہوں؟ انسان میں یہ تمام صفات کس خالق کا عطیہ قرار دو گے؟ پلاسٹک کے ایک حقیر ٹکڑے کے صانع کا انکار نہیں کرتے مگر انسان کے خالق کا انکار کرتے ہو؛ کیوں؟ تمہیں موت دینے کا فیصلہ کون کرتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ تم اپنی موت کو موٴخر نہیں کر سکتے؟ وہ کون ہے جس کے اِرادے کے آگے تم مقہور ہو اور اُس کی لائی ہوئی اَجل کو موٴخر کرنے سے عاجز ہو؟ زمین پر موجود تمام چیزیں تمہارے لئے کس نے پیدا کی ہیں، اِس طرح سے کہ اگر اُن میں سے ایک بھی مفقود ہو یا اُن کی مقدار میں معمولی کمی آجائے یا اُن کے درمیان موجود تناسب باقی نہ رہے تو روئے زمین

پر تمہاری زندگی ناممکن ہو جائے۔ اگر زمین کا درجۂ حرارت کم یا زیادہ ہو جائے، سورج سے اِس کا فاصلہ کم یا زیادہ ہو جائے، غرض کوئی بھی چیز اگر اپنی طبیعی حالت سے نکل جائے تو زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے تمہاری زندگی مشکل ہو جائے۔ یہ سب کچھ اِس دقیق نظم اور گہرے باریک تناسب کے ساتھ کس نے پیدا کیا ہے؟ زمین و آسمان کے درمیان یہ یگانگت اور تنسیق کہ وہ مل کر ایک وحدت کی طرح کام کر رہے ہیں، تمہاری ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں، ایک پانی برساتا ہے تو دوسرا اُس کے ذریعے غلہ اور پھل اُگاتا ہے، یہ کام کس کا ہے؟ زمین و آسمان کی ہر چیز میں علم و حکمت کی یہ نشانیاں اور آثار اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اُس ذات نے پیدا کیا ہے جو سب کچھ جانتی ہے۔

جس حقیقت کی طرف اِس مبارک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اُسے اب چودہ سو سال بعد کہیں جا کر انسان جان سکا ہے۔ سائنس کا علم اب قرآن کی یہی بات کہتا ہے کہ زمین کی ہر چیز چاہے وہ حیوانات ہیں، نباتات ہیں یا عناصر اور اُن کے مرکبات، یہ تمام اِسی مخصوص تناسب میں انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ تمام جاندار ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح مربوط ہیں کہ اگر اُن میں سے ایک فنا ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے تمام اُس کے پیچھے فنا کی گھاٹ اتر جائیں گے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ٹوٹے ہوئے ہار کے دانے اور یہ وہی مطلب ہے جو درج ذیل روایت میں بیان ہوا ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال عمر بن الخطاب سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول خلق الله عز و جل ألف أمه ستمائئه في البحر و اربعمائه في البر فأول شيء يهلك من هذه الأمم الجراد فاذا هلكت تتابعت مثل النظام ازا قطع سلكه۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرؓ نے کہا کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے ایک ہزار اُمتیں پیدا فرمائیں جن میں سے چھ سو پانی میں اور چار سو خشکی پر ہیں اِن میں سے جو پہلے فنا ہو گی، وہ ٹڈے ہیں۔ پس جب یہ ہلاک ہو جائیں گے تو اِن کے بعد دوسرے زندہ انواع اِس طرح ایک دوسرے کے پیچھے فنا ہوں گی جس طرح کسی ہار کا دھاگہ ٹوٹ جائے۔

(۲۹)۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات زمینیں اور سات آسمان پیدا کئے ہیں۔ آج علمی تحقیقات کے نتیجے میں انسان پر واضح ہو گیا ہے کہ زمین کے سات طبقے ہیں اور زمین کے اوپر زمین کے ساتھ مربوط فضاء بھی سات طبقات پر مشتمل ہے، انسان یہ بھی جان چکا ہے کہ ایٹم کے گرد مدار کی زیادہ سے زیادہ تعداد بھی سات ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اِس کے ساتھ مربوط ستارے اور کہکشائیں بھی ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے گرد سات آسمان لپٹے ہوئے ہیں۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ مراد لی ہے کہ لگتا ہے زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی ہو مگر یہ ایک غلط فہمی ہے، درج ذیل دلائل کی بنیاد پر:

- خود اِس آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر اللہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا یعنی آسمان تیار موجود تھا۔
- یہ توجہ آسمان کی تسویۂ یعنی اُس کے سات آسمانوں کی شکل میں تشکیل دینے سے متعلق ہے نہ کہ اُس کی پیدائش سے۔
- قرآن صریح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ زمین و آسمان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے ہم نے اُنہیں علیٰحدہ کیا۔ اِس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک کا دوسرے کے بعد کا ذکر کیا جانا اِن کی اولین پیدائش کے حوالے سے نہیں بلکہ اِن کے تسویۂ اور برابر کرنے کے حوالے سے ہے۔ قرآن اِس بارے میں فرماتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَنَّ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَـٰهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (٣٠) الانبياء ٣٠

کیا کافر یہ بات نہیں سمجھتے کہ زمین اور آسمان آپس میں جُڑے ہوئے تھے تو ہم نے اُنہیں علیٰحدہ کیا اور ہر جاندار کو ہم نے پانی سے پیدا کیا، تو کیا ایمان نہیں لاتے۔

اِس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں تمام کائنات، زمین، سورج، آسمان اور تمام اجرام ایک واحد کتلہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے ایک دھماکے کے نتیجے میں اُنہیں علیٰحدہ علیٰحدہ کرکے موجودہ صورت میں ڈھال دیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے انسان آج کہیں جاکر جان سکا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَـٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓاْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

(۳۰)۔ اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین پر ایک خلیفہ (نائب) پیدا کرنے والا ہوں، اُنہوں نے عرض کیا: کیا اِس زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اِس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا حالانکہ ہم تمہاری حمد میں مصروف ہیں اور تمہاری تسبیح اور تقدیس بجالارہے ہیں۔ اُس نے فرمایا میں وہ سب کچھ بہتر جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

---

(۳۰) قرآن اکثر کوئی اہم بات کرنے کے بعد اُس کی مزید وضاحت کے لئے تاریخی مثالیں اور عملی نمونے پیش کرتا ہے، یہ تاریخی مثالیں اور عملی نمونے (اذا) کے لفظ سے شروع ہوتے ہیں۔ یہاں پر اِس اہم بات کے بعد کہ زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت اور فائدے کے لئے پیدا کی ہے، اب مزید توضیح کے لئے آدم علیہ السلام کی بطور خلیفہ پیدائش کا قصہ اور فرشتوں کو اُسے سجدہ کرنے کی ہدایت، پیش کی جاتی ہے۔

اِس مبارک آیت میں چند بنیادی رہنمائیاں کی گئی ہیں، وہ یہ کہ:

- آدم علیہ السلام زمین پر پیدا کئے گئے۔ یہاں پر "جاعل" کا معنی پیدا کرنا ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتادیا کہ میں زمین پر ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرنے والا ہوں جو ایک خلیفہ اور نائب کی مانند عمل کرے گی اور اُنہیں اِس خلیفہ کی صفات اور استعدادات بتادیں۔ فرشتے یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ایک بااختیار اور ارادے کی مالک مخلوق کے ہاتھ میں زمین کی باگیں کس طرح دی جاسکتی ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہے اپنے اقتدار اور اختیار کو غلط استعمال کرے گا، فساد برپا کرے گا اور قتل و غارت میں پڑ جائے گا۔ اِس لئے اُنہوں نے کہا کہ: ہم تمہارے اَوامر کی تعمیل میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول ہیں، زمین کی تقدیس اور اُسے پاکیزہ رکھنے کے امور بھی بجا لائے جارہے ہیں، پھر اِس خلیفہ اور نائب کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ اُس سے فساد پھیلانے اور خون بہانے کا احتمال بھی موجود ہے۔ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی تمام استعدادات کا علم نہیں تھا صرف اتنا سمجھے تھے کہ یہ خلیفہ ہو گا اور اُنہوں نے خلیفہ سے اتنا ہی مفہوم اخذ کیا تھا یا اُنہیں بتایا گیا تھا کہ یہ ارادے اور اختیار کا مالک ہو گا، نیک کام بھی کر سکتا ہو گا اور چاہے گا تو برا کام بھی کر سکتا ہو گا۔ تمہاری طرح نہیں ہو گا کہ کوئی کام اپنی مرضی اور ارادے سے نہیں کر سکتے، اِسی لئے اُنہوں نے کہا کہ: مبادا یہ فساد اور خون بہانے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی جو استعدادیں میں اُسے دینے والا ہوں وہ تمہیں معلوم نہیں ہیں۔ نہ تو فرشتوں سے کی گئی یہ گفتگو کوئی مشورے کی بناء پر تھی اور نہ فرشتوں کے سوالات کچھ اعتراض کی بنیاد پر تھے۔ اللہ تعالیٰ مشورے سے بے نیاز ہے اور فرشتے اعتراض کرنے سے ماوراء ہیں۔ یہ بات بھی بے بنیاد اور کسی دلیل کے بغیر ہے کہ فرشتوں نے جنوں کے کرتوت نظر میں رکھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ اِس کی اولاد بھی اُنہی کی طرح ہو جائے گی۔ اِس کے برعکس حقیقت صرف اتنی تھی کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے معلومات ہی اتنی دے رکھی تھیں کہ اُن کے دل میں یہ سوالات جنم پاگئے۔
- اس آیت میں تین مرتبہ کہا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر پیدا ہوں گے اور زمین کی خلافت اُسے تفویض کی جائے گی۔ ایک مرتبہ اللہ کی طرف سے اور دو مرتبہ فرشتوں کی زبان سے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کہ آدم علیہ السلام زمین پر پیدا کئے گئے تھے اور زمین کی خلافت پر مامور کئے گئے تھے اتنا ہی کافی ہے۔ قرآن کی کسی دوسری آیت میں نہ تو صراحتاً اور نہ ہی اشارتاً کوئی ایسی بات تلاش کی جاسکتی ہے جس سے اِس کے خلاف کوئی دوسری بات نکل سکتی ہو۔ تعجب ہے اگر قرآن کی اِس صراحت کے باوجود اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر کوئی یہ گمان کرے کہ آدمؑ زمین کے علاوہ کسی اور جگہ پیدا کئے گئے تھے۔

وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٣١﴾ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٣٢﴾

(۳۱)۔ اور آدم علیہ السلام کو نام سکھادیئے، تمام کے تمام، پھر فرشتوں کے سامنے پیش کیا تو فرمایا مجھے اِن کے نام بتادو، اگر تمہارا خیال درست ہے۔ (۳۲) اُنہوں نے عرض کیا: پاک ہے تیری ذات ہم اُس سے زیادہ کوئی علم نہیں رکھتے جو تُو نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک تو ہی علم والا اور حکمت کا مالک ہے۔

(۳۱،۳۲)۔ اللہ جل شانہ نے آدمؑ اور اُس کی اولاد کو فرشتوں پر یہ فضلیت دی ہے کہ اِن کا علم فرشتوں سے زیادہ جامع ہے۔ اِن میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جاننے اور اُسے ایک مخصوص نام سے موسوم کرنے کی صلاحیت رکھی ہے مگر فرشتے اِس طرح بنائے گئے ہیں کہ اُن کی ہر صنف صرف اپنے مخصوص کام کے بارے میں علم رکھتی ہے، اُس سے ہٹ کر دوسری چیزوں کے بارے میں علم نہیں رکھتی۔ ہر چیز کو جاننا اور پھر اُسے ایک خاص نام دینا انسان کی انفرادیت ہے یہ خصوصیت دوسری کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ زمین کی خلافت کے لئے ایسی ہی مخلوق کی ضرورت تھی، فرشتے یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ فرشتے زمین کی خلافت کے امیدوار تھے اور چاہتے تھے کہ یہ ذمہ داری کسی دوسرے کے سپرد نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ملامت (لاجواب) کرنے کے لئے ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آدمؑ اِس مقام کا تم سے زیادہ مستحق ہے تو آدم علیہ السلام کو چپکے سے کان میں بتادیا گیا کہ فلاں فلاں چیز کا کیا نام ہے۔ پھر اُنہی چیزوں کے ناموں کے بارے میں اُس کا اور فرشتوں کا امتحان لیا گیا جس میں فرشتے ناکام اور آدمؑ کامیاب ٹھہرے۔ حالانکہ نہ تو یہ کام امتحان کی غرض سے کیا گیا ہے نہ فرشتے ایسی مخلوق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کریں یا اپنے لئے کسی ذمہ داری کا تقاضا کریں اور نہ ہی ایسے کسی امتحان سے آدم علیہ السلام کی برتری ثابت کی جاسکتی ہے۔ یہ اسرائیلی روایات سے لی گئی آراء ہیں اِن میں اللہ تعالیٰ کی طرف عدل اور عقل دونوں کے خلاف افعال منسوب کئے گئے ہیں اور فرشتوں کی طرف بھی گناہ کے کام منسوب کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عدل کے خلاف کوئی کام کرتا ہے اور نہ ہی عقل کے خلاف، اِس قسم کی آراء عدل کے بھی خلاف ہیں اور مشاہدے کے بھی۔ ایک ایسا امتحان جس میں ایک فریق کو نقل کی سہولت دی جائے عدل کے منافی امتحان ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام اور اُس کی اولاد کو تمام چیزوں کے نام نہیں سکھائے گئے۔ درج ذیل دلائل کی بنیاد پر:

- اگر اُس کو نام سکھائے گئے ہوتے تو چاہیے تھا کہ اُس کی اولاد میں یہ نام قیامت تک نسل در نسل آرہے ہوتے۔ چاہیئے تھا کہ اُس کی عجمی اور عربی اولاد ملتے جلتے نام استعمال کرتی اور اِس طرح ساری دنیا کی ایک ہی زبان ہوتی مگر ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ نہ تو زبان ایک ہے اور نہ ہی چیزوں کے نام۔ معلوم نہیں یہ لوگ قرآن کی ایسی تعبیر کیوں اور کہاں سے لاتے ہیں جو عام مشاہدے کے بھی خلاف پڑتی ہے؟ آدم علیہ السلام کو نام اِسی طرح سکھائے گئے ہوں گے جس طرح آج اُس کی اولاد کو اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصہ تو بیان ہی اِس لئے کیا جارہا ہے کہ اُس کی اولاد کو بتایا جائے کہ تمہیں اللہ نے یہ اور یہ انعامات عطا کئے ہیں، تم کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی گئی ہے حتّیٰ کہ فرشتوں پر بھی؛ ہر چیز کو پہچاننا اور اُس کے لئے مخصوص نام وضع کرنا تمہاری وہ خصوصیت ہے جو دوسری کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئی۔ جس ترتیب سے اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد کو نام سکھاتا ہے اِسی طرح خود آدم علیہ السلام کو بھی سکھائے ہیں۔ آدم علیہ السلام کا جو بھی نوا سا پیدا ہوتا ہے، وہ ہر چیز پر ہاتھ ڈالتا ہے، اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے تو ماں، باپ، روٹی اور پانی کو اپنی طرف سے کوئی نام دے دیتا ہے۔ ابتداء میں رو کر کھانا پینا مانگتا ہے، جب کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو اپنی ضرورت کی چیزوں کے ایسے چھوٹے چھوٹے نام رکھتا ہے کہ اپنی ماں کو ہی سمجھا سکتا ہے۔ اگر ماں باپ اپنی زبان کے الفاظ اُس کے منہ میں نہ ڈالیں تو وہ اپنے لئے نئے نام اور زبان تراش لیتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو نام سکھانے کا معنی یہی ہے نہ کہ وہ جو اسرائیلی روایات میں آیا ہے۔
- تمام چیزوں کا علم اللہ کے علاوہ کسی کے لئے ممکن نہیں، آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد یہ طاقت نہیں رکھتی کہ تمام اشیاء کے نام یاد اور حفظ کر سکیں اُن کے حافظے کا یہ ظرف ہے ہی نہیں۔
- اِس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن حق و باطل کی پہچان کی آخری کسوٹی اور معیار ہے۔ ہر اختلافی بات میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور صرف اُسی بات کو حق قرار دینا چاہیئے جو قرآن کے ساتھ موافقت رکھتی ہو۔ روایت کو بھی ہم قرآن کے ترازو میں تولیں گے چہ جائیکہ قرآن کی آیت کی تاویل روایت کی روشنی میں کرنے لگ جائیں۔ یہ تو وہی کام ہے جو اہلِ کتاب نے کیا، نتیجے کے طور پر اللہ کی کتاب تو پسِ منظر میں چلی گئی اور وہ خود روایات کے پیچھے لگ کر اختلافات میں پڑ گئے۔ کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ وہ بات کہہ ڈالیں جو قرآن نے نہیں کہی، صحابہ تو قرآن کے اولین حاملین اور سیکھنے والے تھے، ہر کسی سے زیادہ قرآن کو سمجھتے تھے، اُس ہستی سے براہ راست پڑھے ہوئے تھے جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ قرآن کے خلاف کوئی بات کہہ گئے ہوں گے؟ جب کبھی کسی ایسی روایت کا سامنا ہو جائے جو قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی تو بجائے قرآن کی آیات کی تاویل کرنے کے، ہمیں چاہیے کہ یہ کہہ دیں کہ یا تو راوی اشتباہ میں پڑ گیا ہے اور یا مروی اہلِ کتاب کی کوئی بات کر رہا تھا مگر سننے والے کو گمان ہوا کہ یہ اُس کی اپنی بات اور رائے

ہے چنانچہ دوسروں کو اُس کی رائے اور بات کی حیثیت سے منتقل کر بیٹھا۔ روایات میں کثیر التعداد ایسی روایات موجود ہیں جو درحقیقت اہل کتاب کی روایات ہیں مگر صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب ہو گئی ہیں۔

- (عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا) کی تفسیر سب سے پہلے قرآن میں تلاش کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیئے کہ (علم َ) کس معنی میں آیا ہے۔ قرآن نے اِس کی وضاحت کی ہوئی ہے۔ قرآن کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینا اُسی طرح ہے جس طرح اُس کی اولاد کو بیان کی تعلیم کے بارے میں کہا گیا ہے۔(علمه البيان: اُسے باتیں کرنا سکھا دیا)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنے کی استعداد دی ہے۔ یہ سکھانا اِس طرح نہیں ہے کہ وہ پیدائش کے پہلے ہی دن سے باتیں کر سکتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ سیکھتا ہے۔ اُسے تمام چیزوں کو پہچاننے اور اُن کا نام رکھنے کی استعداد دی گئی ہے۔

قَالَ يَـٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئۡهُم بِأَسۡمَآئِهِمۡۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسۡمَآئِهِمۡ قَالَ أَلَمۡ أَقُل لَّكُمۡ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ غَيۡبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَأَعۡلَمُ مَا تُبۡدُونَ وَمَا كُنتُمۡ تَكۡتُمُونَ ﴿٣٣﴾

(۳۳)۔ فرمایا: اے آدم! اِن کو نام بتا دو توجب اُس نے نام بتا دیئے، تو فرمایا: کیا میں نے بتایا نہیں تھا کہ میں زمین اور آسمانوں کے اسرار خوب جانتا ہوں اور اُس چیز کو بھی خوب جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اُسے بھی جو تم چھپاتے ہو۔

---

(۳۳)۔ اس مبارک آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی اُس علمی استعداد اور صلاحیت کا علم نہیں تھا جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے زمین کی خلافت کے لئے اُس کا انتخاب کیا تھا۔ اُس کے اختیار اور ارادے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فرشتوں نے اِس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ مبادا یہ زمین میں فساد اور خون ریزی کا باعث بن جائے۔ یہ ایک بے بنیاد بات ہے کہ فرشتے اپنے لئے زمین پر خلافت کے مقام کے طلب گار تھے۔

وَإِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلَـٰٓئِكَةِ ٱسۡجُدُواْ لِأٓدَمَ فَسَجَدُوٓاْ إِلَّآ إِبۡلِيسَ أَبَىٰ وَٱسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلۡكَـٰفِرِينَ ﴿٣٤﴾

(۳۴)۔ اور جب ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کے لئے سجدہ بجالاؤ؛ تمام سجدے میں گر گئے سوائے ابلیس کے، اُس نے پہلو تہی کی اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

(۳۴)۔ یہاں پر چند باتیں غور طلب ہیں۔

- اِس سجدے سے یا تو صرف اطاعت اور تسلیم ہونا مراد ہے اور یا اطاعت اور تسلیم ہونے کے ساتھ سجدے سے ملتا جلتا کوئی فعل بھی۔ اِس لئے کہ فرشتے اور ابلیس انسان کی شکل و صورت کے تو ہیں نہیں کہ اُن کا سجدہ بھی انسان کے سجدے سے ملتا جلتا ہو۔ سورج، چاند، درخت اور پہاڑوں کا سجدہ بھی انسان کے سجدے کی طرح نہیں ہے۔ اِس توجیہہ کی بدولت وہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ فرشتوں کا سجدہ آدم علیہ السلام کو تھا یا آدم علیہ السلام کی پیدائش پر اللہ کو؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ جائز نہیں۔
- اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا مقام و منزلت اِس عالم میں اِس طرح ہے کہ کسی کو اُن کے سجدہ اور سرِ تسلیم خم کر دینے کے بعد زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اُس کے لئے مسخر ہو جاتی ہے۔ آدم علیہ السلام کو اُن کے سجدے کے نتیجے میں ہر چیز اُس کے آگے مسخر ہو گئی اِس لئے کہ اُنہوں نے سجدہ کر لیا، صرف ابلیس نے نہیں کیا۔ لہٰذا تمام چیزیں آدم علیہ السلام کو مسخر ہو گئیں۔ تمام چیزوں کے مسخر ہو جانے کا یہ مفہوم قرآن مجید کے متعدد آیات میں آیا ہوا ہے۔
- روئے زمین پر سب سے پہلا گناہ تکبر تھا۔ سب سے پہلے متکبر کو اللہ کی رحمت سے دھتکارا گیا ہے۔ متکبر کون ہے؟ وہ جو نسب کی بنیاد پر دوسروں سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھتا ہے۔ اپنی قوم کو دوسری قوم سے، اپنے خاندان کو دوسرے خاندان سے اور اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھنا وہی کام ہے جو سب سے پہلے شیطان نے کیا تھا۔ اِس سورت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل کے سردار طالوت کی زعامت سے انکار کرتے تھے، یہ وہی کام تھا جو شیطان نے کیا تھا۔ طالوت کے ذکر کا مقصد اِسی بات کی تشریح کرنا اور تاریخ سے اِس کی مثال پیش کرنا ہے۔

وَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيْطَـٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَـٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

(۳۵)۔ ہم نے کہا: اے آدم: تم اور تمھاری بیوی اِس جنت میں سکونت رکھو، اور جہاں سے چاہو بفراغت کھاؤ مگر اِس درخت کے قریب نہ جاؤ، نہیں تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۳۶) مگر شیطان نے اُن کو پھسلا کر اُس حال سے نکال دیا جس میں وہ تھے

اور ہم نے کہا: یہاں سے اُتر جاؤ، تم میں سے بعض، بعض دوسروں کے دشمن بن کر اور تمہارے لئے زمین میں جائے قرار اور کچھ متاع مہیا ہے، ایک وقت تک۔

(۳۵)۔اِس مبارک آیت کے کچھ بنیادی نکات قابل توجہ ہیں:

- انسان اِس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اُسے مفید اور مضر، حلال اور حرام، نیک و بد سمجھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ دوسری زندہ مخلوقات کے ساتھ ایک بنیادی فرق یہ رکھتا ہے کہ دوسروں کو فطرت کی طرف سے اُن کا راہ عمل بتایا جاتا ہے اور اُسی فطری رہنمائی میں وہ زندہ رہتے ہیں۔ بکری کا بچہ پیدائش کے پہلے دن اور پیدائش سے چند لحظے بعد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے، اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگ جاتا ہے، اُن چیزوں کے کھانے اور اُس کام کے کرنے سے بچتا ہے جو اُسے نقصان پہنچاتے ہیں اور مفید اور مضر پہچانتا ہے۔ مگر انسان ایک لمبے عرصے تک ماں کا شدید محتاج ہوتا ہے، آگ، پتھر، مٹی کے ڈھیلے ہر چیز پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اُسے اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے۔ اگر چند لمحے کے لئے بھی ماں کی توجہ ہٹ جائے تو آگ میں گرتا ہے یا پانی میں۔ ضرورت مند ہوتا ہے کہ اُسے نیک و بد، مفید و مضر، شہد اور زہر اور حلال و حرام عملاً سکھا دیئے جائیں۔ کسی بھی دوسری مخلوق سے زیادہ وہ اِس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ اُسے اچھی زندگی گذارنے کے تمام تقاضے اور لوازمات سکھا دیے جائیں، فطری رہنمائی اُس کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اِس پہلو سے وہ دوسری مخلوقات سے بہت مختلف ہے اور اپنی کچھ انفرادی استعدادات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ دیکھیں جنت میں بھی اُسے بتایا جارہا ہے کہ ہر جگہ سے ہر چیز بفراغت کھائے مگر اُس مخصوص درخت کے قریب نہ جائے۔ یہ کہہ کر قرآن عظیم الشان انسانی فطرت کے ایک اہم اور بنیادی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
- انسان کے لئے حلال چیزوں کی بہ نسبت حرام کی تعداد یوں سمجھیں جیسے ایک بڑا باغ ہو جس میں قسم قسم کے پھل اور پودے ہوں اور اُن میں سے صرف ایک درخت ایسا ہو جس کا پھل منع کیا گیا ہو۔ تعجب ہے کہ انسان اتنی لاتعداد حلال کے ہوتے ہوئے حرام کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔
- تاہم یہ بات کہ آدم علیہ السلام کو کس جنت میں بسایا گیا تھا؟ روئے زمین پر موجود کسی جنت میں یا اُس موعود جنت میں؟ کس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا تھا؟ شیطان کس طرح اِس پر قادر ہوا کہ اُس جنت میں داخل ہو جائے اور آدم و حوا علیہما السلام کو اُس درخت کا پھل کھانے پر اُکسائے؟ اِن باتوں کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات ذہن میں رکھیں:

- اس بارے میں موجود روایات میں بھی متعدد اور گہرے اختلافات موجود ہیں اور مفسرین میں بھی، جنت کے مقام کے بارے میں بھی اور اُس درخت کی نوع کے بارے میں بھی۔ اِس اختلاف سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے اِس بارے میں کوئی صحیح اور صریح حدیث نقل نہیں ہوئی ہے۔
- قرطبی اور بعض دوسرے مفسرین اِسے موعود جنت قرار دیتے ہیں مگر دلیل کوئی نہیں رکھتے۔ مفسرین بھی سب کے سب اُن کے ساتھ موافقت نہیں رکھتے اور میں نے یہ رائے قرآن کے بھی موافق نہیں پائی۔ اِسی سورت کی آیت ۳۰ میں تین مرتبہ یہ کہا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر پیدا ہو گا اور یہاں خلیفہ ہو گا۔ دوسری طرف ایسا کوئی مفہوم کہ آدم علیہ السلام آسمان میں پیدا ہوا، نہ تو قرآن کی کسی آیت میں صراحتاً یا اشارتاً ملتا ہے، نہ احادیث میں آیا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی ایسی بات کہی گئی ہے کہ پیدائش کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا۔ اب ایک ایسی صورتحال میں یہ دعویٰ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ اُن کا پہلا مسکن آسمان پر واقع جنت تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن میں یہ بات نہایت صراحت کے ساتھ آئی ہوتی کہ آدم علیہ السلام پہلے زمین پر پیدا ہوئے پھر آسمانوں پر لے جائے گئے اور یا یہ کہ آسمان میں پیدا ہوئے۔ قرآن پر ایمان کا تقاضا ہے کہ اپنی طرف سے کوئی مطلب اُس کی طرف منسوب نہ کیا جائے تاکہ اُس آیت کا مصداق نہ ٹھہر جائیں کہ (تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ) اور اُسی پر اکتفا کریں جو قرآن خود کہتا ہے۔
- آدم علیہ السلام مٹی سے، روئے زمین کے اوپر اور زمین کی خلافت کے لئے پیدا کئے گئے، یہیں پر وفات پا گئے، یہیں سے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور یہی اُن کی اولاد کا بھی مقدر رہے۔
- بعض لوگوں نے (اهْبِطُوْا مِنْهَا) کے لفظ سے یہ مراد لیا ہے کہ اُنہیں آسمانوں سے اُترنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات دو دلائل کی بنیاد پر ضعیف ہے۔ پہلی یہ کہ اِسی سورت میں چند آیات کے بعد بنی اسرائیل کو کہا گیا ہے کہ (اِهْبِطُوْا مِصْراً: مصر کی سرزمین پر اتر جائیں) اور مزید یہ کہ بنی اسرائیل کا قصہ درحقیقت جنت سے آدم علیہ السلام کے نکلنے کے واقعے کے لئے تاریخ سے ایک مثال ہے اور اِسی کی مزید شرح ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ (اهبطو: اتر جائیں) کا حکم اُس شخص کو دیا جا سکتا ہے جو اُترنے کی اُس جگہ سے خود اپنے پیروں پر چل کر اتر سکتا ہو جبکہ آسمان سے آدم علیہ السلام کے لئے خود سے اترنا ممکن نہیں تھا۔

- آدم علیہ السلام پیدائش کے بعد ایسی جنت میں بسایا گیا ہے جہاں شیطان آمد و رفت کر سکتا تھا اور شجر ممنوعہ بھی موجود تھا۔ موعود جنت میں نہ تو کوئی ممنوعہ درخت ہے اور نہ شیطان وہاں داخل ہو سکتا ہے۔ شیطان تو اِس سے قبل ہی دھتکارا گیا تھا لہٰذا وہ وہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔
- جنت کا لغوی معنٰی باغ ہے اور قرآن میں جنت کا لفظ صرف موعود جنت کے لئے مخصوص کر کے استعمال نہیں کیا گیا۔ اِسی طرح جنت پھلوں کے باغ کو کہا جاتا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ شجرِ ممنوعہ بھی پھلوں ہی کا کوئی درخت رہا ہو گا۔ قرآن نے اِس کی مزید صراحت نہیں کی اِس لئے ہمیں بھی چاہیے کہ اِس بارے میں اپنی طرف سے ملا کر کچھ نہ کہیں مگر افسوس ہے کہ کچھ لوگ اِس پہلو سے بھی اسرائیلی روایات کے زیرِ اثر آ گئے ہیں اور اُنہوں نے اِسے گندم کا پودا قرار دیا ہے۔ اِس بات کی طرف بھی توجہ نہیں دی کہ گندم کا نہ تو درخت ہوتا ہے اور نہ ہی باغ، نیز اِس پر بھی غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ہمیشہ وہی چیزیں حرام قرار دی ہیں جن کا نقصان اُن کے فائدے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔
- موعود جنت میں داخلہ محاسبے کے بعد ہو سکتا ہے۔ یہ جنت دراصل انسان کے اعمال کا حاصل ہے جس طرح کہ روایات میں آتا ہے: جنت کی زمین زرخیز اور اُس کا پانی میٹھا ہے۔ تمہاری تسبیح جنت کے درخت اور نیک اعمال جنت کے قصر (محل) بن جاتے ہیں۔
- اِن دلائل سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ جنت زمین پر واقع تھی نہ کہ آسمان پر۔ اُن مفسرین کی رائے درست ہے جو اِسے زمین پر قرار دیتے ہیں اور یہ رائے کہ یہ وہی موعود جنت تھی اور آسمان پر واقع تھی، اسرائیلی روایات سے لی گئی ہے۔ اِس کی تائید میں دیئے گئے دلائل نہایت ہی ضعیف ہیں، اُن سے یہ بات نہ عقلی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے اور نہ ہی نقلی طور پر؛ بلکہ اِس حوالے سے اِن لوگوں کی بعض باتیں تو نہایت ہی قابلِ تعجب ہیں خصوصاً جنت میں شیطان کے داخلے کے بارے میں اُن کا بیان۔ بعض کہتے ہیں کہ سانپ کے منہ میں چھپ کر داخل ہوا تھا، بعض دوسرے کہتے ہیں کہ دیوار کے پیچھے سے، دروازے میں کھڑے ہو کر، باہر سے، یا یہ کہ جنت سے باہر نکلتے وقت اور حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اُس نے زمین پر بیٹھ کر آسمان میں آدم اور حوا علیہما السلام کو پھسلایا تھا۔ بعض دوسرے تو بے باکی کی انتہا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیطان فرشتوں میں سے بلکہ اُن کا استاد تھا۔ اُنہوں نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ اگر آدم علیہ السلام شیطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تو آج اُس کی اولاد بھی اُس کو دیکھنے پر قادر ہوتی۔ اِنہوں نے یہ غور کیوں نہیں کیا کہ آدم علیہ السلام کے دل میں شیطان کا وسوسہ ڈالنا بالکل ویسے ہی رہا ہو گا

جیسے کہ آج وہ اُس کی اولاد کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ اگر آپ اُن کے استدلالات پر غور کریں تو اُن میں سے ہر ایک کو عقل اور مشاہدے کے خلاف پائیں گے۔ سمجھ نہیں آتی یہ لوگ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ آدم علیہ السلام کی جنت اُسی طرح تھی جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے بادلوں کا سایہ اور من وسلویٰ، اُس کا جنت سے ہبوط اِسی طرح تھا جیسا کہ بنی اسرائیل کا ہبوط اور شیطان نے اُن کے دلوں میں اُسی طرح وسوسہ ڈالا جیسے اُس کی اولاد کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ یہ اِس لئے کہ آدم علیہ السلام کے قصے میں اللہ تعالیٰ ہمیں انسان اور اُس کے استعدادات کا تعارف کراتا ہے، انسان کے عروج اور زوال کے عوامل بتاتا ہے اور شیطان اور اُس کے وسوسوں کی نشاندہی کراتا ہے۔ یہ ہمارے دادا کی کہانی ہے، اِس قصے کے آئینے میں ہمیں اپنا چہرہ دیکھنا ہے تاکہ ہم اپنے آپ کو پہچان لیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آدم علیہ السلام کے اِس قصے کے بعد بنی اسرائیل کے عروج اور زوال کی تاریخ لائی گئی ہے، کیا یہ قصہ اُس کی شرح نہیں ہے؟؟

- اِس مبارک آیت میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ آدم اور حوا علیہا السلام کو کہا گیا تھا کہ اِس درخت کے قریب نہ جائیں۔ اگر قریب پھٹکے تو حدود پار کر لوگے اور ممنوعہ پھل کھا بیٹھوگے۔ گناہ سے بچنے کے لئے قرآن نے متعدد دوسرے مقامات پر بھی اِسی سے ملتی جُلتی رہنمائی کی ہے اور کہا ہے کہ گناہ کی جگہ سے دور رہیں، قریب بھی نہ پھٹکیں، حلال چیزوں کی آخری حد تک آگے نہ بڑھیں اور جہاں سے حرام کی سرحد شروع ہوتی ہے اُس کے قریب نہ جائیں؛ نہیں تو حرام میں آلودہ ہو جاؤ گے۔ جو کوئی اپنا ریوڑ دوسروں کی چراگاہ کے قریب چَراتا ہے، لازم ہے کہ اُس کے مویشی دوسروں کے کھیت میں گھُسیں گے۔

(۳۶)۔ شیطان نے اُن کو بہکایا اور اُس جنت کی تمام نعمتوں سے محروم کر دیا۔ قرآن یہ کہہ کر ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ شیطان کے وسوسوں کے آگے ہار جانا ایک طرف تو انسان کے بہکنے کا باعث بن جاتا ہے، اُسے الہیٰ نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے، عزت کے بلندیوں سے نیچے گِرا دیتا ہے اور دوسری طرف اُسے عداوت اور دشمنوں سے دوچار کر دیتا ہے۔

فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

(۳۷)۔ تو آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے الفاظ سیکھ لئے جس کے نتیجے میں اُس کی توبہ قبول ہو گئی، بے شک وہ انتہائی مہربان توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(۳۷)۔ آدم علیہ السلام نے توبہ کاارادہ کیا، ایسے الفاظ کی تلاش شروع کی جن میں اپنی ندامت بیان کر سکے اور اللہ نے اُسے وہ الفاظ سکھا دیئے جنہیں ادا کر کے وہ اپنی ندامت کا اظہار کر سکتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت بھی مانگ سکتا تھا۔ اُنہی الفاظ کو ادا کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُس کی توبہ قبول فرمالی اور اُس کی خطا معاف کر دی۔ قرآن اُن کلمات کے بارے میں اِس طرح فرماتا ہے:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾ الاعراف ۲۳

دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! واقعی ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا، اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور ہمارے اوپر رحم نہ کرے، تو یقیناً ہم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

یہ حقائق نقل کر کے قرآن ہمیں سمجھاتا ہے کہ خطا، اور غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے غلطی کرنا اور غلط فہمی میں پڑ جانا تمہاری فطری کمزوری ہے۔ لیکن اگر غلطی کے بعد توبہ کر لو، ندامت کا اظہار کر لو، اللہ کی طرف رجوع کر لو اور اپنی غلطی کی اصلاح کی کوشش میں لگ جاؤ تو اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا اور مہربان پاؤ گے۔

قُلۡنَا ٱهۡبِطُواْ مِنۡهَا جَمِيعٗاۖ فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدٗى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَكَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَآ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٣٩﴾

(۳۸)۔ ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، لیکن جب بھی میری طرف سے کوئی ہدایت آجائے، تو جس نے میری ہدایت کی متابعت کی، اُسے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ حزن۔ (۳۹) اور جو لوگ کافر ہو جائیں گے اور میری آیات کی تکذیب کریں گے وہ دوزخی ہیں اُس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۳۸-۳۹)۔ آدم علیہ السلام کو اپنی لازمی ضرورتیں اُس جنت میں حاصل تھیں، یہ بھی عملاً اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ شیطان اُس کا دشمن ہے، حرام کی ترغیب دیتا ہے اور یہ کہ حرام میں پڑ کر وہ اِلٰہی نعمتوں سے محروم ہو کر اپنے بلند مقام سے گر جائے گا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کر کے ندامت کا اِظہار کرنا چاہئیے اور اگر کوئی اپنے گناہ پر اِصرار کرے تو شیطان کی طرح مردود ہو جائے گا۔ اور یہ کہ اب وہ اپنی ماموریت کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے تیار ہے اور اُسے چاہئیے کہ جا کر اپنی خلافت کے کام کو سنبھالے۔ اگرچہ اُس کی توبہ قبول ہو گئی مگر اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے اُسے جنت

سے نکل جانا چاہئے۔ لہٰذا اَب اُسے کہا گیا: کہ تمہارے پاس الہیٰ ہدایات آتی رہیں گی، یہ اِس لئے کہ آپ اِن کے محتاج ہیں، اِن کے بغیر خیر اور شر میں تمیز نہیں کرسکتے۔ شیطان وہ کچھ تمہیں مزین کرکے دکھاتا ہے جو تمہارے لئے مضر ہے (اِس کی مثال وہ عملاً جنت میں دیکھ چکا تھا) تو جس کسی نے الٰہی رہنمائیوں کی متابعت کی اُسے نہ تو کسی سے ڈرنا چاہیئے اور نہ ہی اُسے کسی چیز پر افسوس ہوگا اور جس کسی نے کفر کا راستہ اِختیار کیا اور میری آیات کی تکذیب کی تو اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ أُوفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَإِيَّٰيَ فَٱرۡهَبُونِ ﴿٤٠﴾

(۴۰) اے اِسرائیل کے بیٹو! میری وہ نعمتیں یاد کرو جو تمہارے اُوپر کر رکھی تھیں اور میرے ساتھ کئے ہوے وعدے وفا کرو تاکہ میں تمہارے ساتھ کئے گئے وعدے پورے کروں اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

---

(۴۰)۔ اِس مبارک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دیندار قوموں کے اِنحراف کی ابتداء تین چیزوں سے ہوتی ہے: ۱۔ الٰہی نوازشات اور نعمتوں کی ناشکری۔ ۲۔ اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدوں سے بے وفائی۔ ۳۔ اور اللہ کے علاوہ دوسروں کا خوف۔ اِس طرح یہ مبارک آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے وعدے مشروط ہیں، یہ صرف اُس وقت پورے ہوتے ہیں جب تم اللہ کے ساتھ کئے گئے اپنے وعدے پورے کر لیتے ہو۔

وَءَامِنُواْ بِمَآ أَنزَلۡتُ مُصَدِّقٗا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُونُوٓاْ أَوَّلَ كَافِرِۭ بِهِۦۖ وَلَا تَشۡتَرُواْ بِـَٔايَٰتِي ثَمَنٗا قَلِيلٗا وَإِيَّٰيَ فَٱتَّقُونِ ﴿٤١﴾

(۴۱)۔ اور اُس چیز پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی ہے، تمہارے پاس موجود (کتاب) کی تصدیق کرنے والی اور اِس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے (کافر) مت بنو۔ اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر مت بیچو اور میرے غضب سے بچو۔

---

(۴۱)۔ اِس مبارک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اولین اور خطرناک دشمن وہ دین فروش ہیں جو دین کی قیمت لگاتے ہیں اور وہ بھی نہایت کم۔ بجائے اِس کے کہ یہ دینی تحریک کا ہر اول دستہ بن جائیں، آپ دیکھ لیں گے کہ یہ دین فروش دکاندار علماء

دینی تحاریک کے خلاف اگلی صفحوں میں اور پیش پیش رہتے ہیں۔ دشمن انتہائی کم قیمت پر اِن کی وفاداریاں خرید لیتے ہیں اور پہلی صفوں میں اِن کو علماءِ حق کے خلاف لڑاتے ہیں۔

وَلَا تَلْبِسُواْ ٱلْحَقَّ بِٱلْبَـٰطِلِ وَتَكْتُمُواْ ٱلْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱرْكَعُواْ مَعَ ٱلرَّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾

(۴۲)۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، (باطل کو حق کا لباس نہ پہناؤ) اور جانتے بوجھتے حق کو نہ چھپاؤ۔ (۴۳) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

---

(۴۲)۔ علمائے سوء غلط توجیہات کا سہارا لے کر حق کو باطل اور باطل کو حق کا لباس پہناتے ہیں اور اگر اپنی جھوٹی توجیہات اور تاویلات سے حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت نہ کر پائیں تو پھر حق کو چھپاتے ہیں۔ باوجود اِس کے کہ خوب جانتے ہیں کہ حق کونسا ہے اور باطل کونسا یعنی بے خبر نہیں ہیں بلکہ غرض اور مرض کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں، خریدے گئے اور مامور کئے گئے ہیں۔ اپنی مزدوری اور اُجرت کی خاطر یہ کام کرتے ہیں، اور مزدوری بھی کتنی: کبھی کوئی تحفہ، کوئی خلعت، ایک وقت کی دعوت اور حتٰی کہ کبھی تو صرف ایک شاباش۔

(۴۳)۔ اِن مبارک آیات میں بھٹکے ہوئے اور گمراہ دین فروش علماء کی چند اور خصوصیتیں بیان ہوتی ہیں: اللہ کے ساتھ اُن کا تعلق ضعیف اور کمزور ہوتا ہے۔ نماز کو یا تو چھوڑ چکے ہوتے ہیں اور یا یہ تعلق اپنی حقیقی روح سے عاری ہوتا ہے صرف رسمیں نبھائی جا رہی ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ دینے کے بجائے زکوٰۃ لینے کے عادی ہو جاتے ہیں، عام لوگوں کے ساتھ روابط کم کر دیتے ہیں اور اُن کے ساتھ اکٹھے عبادت کرنے سے پہلو تہی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اسی لئے اُن کو اِن چند باتوں کی ہدایت کی جا رہی ہے کہ: نماز (اکٹھے) پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو اور دوسرے رکوع کرنے والوں کے ساتھ اکٹھے رکوع کرو۔ تمہارے تمام انحرافات کا علاج اِسی میں ہے۔

أَتَأْمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ ٱلْكِتَـٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾

(۴۴)۔ کیا لوگوں کو نیکیوں کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، کیا عقل سے کام نہیں لیتے۔

(۴۴)۔ وہ (بنی اسرائیل) ریاکاری اور نفاق کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے دوسروں کو صدقہ و خیرات دینے اور نیکی اور احسان کی روِش اپنانے کی تلقین کرتے تھے مگر اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے حالانکہ اُنہیں دوسروں سے زیادہ با عمل اور اللہ کی راہ میں زیادہ قربانی دینے والا ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ وہ تو کتاب کو زیادہ سمجھنے کے دعویدار ہیں اور اپنے آپ کو عالم، اللہ کے کتاب کے حامل اور پیغمبروں کے وارث قرار دیتے ہیں۔

وَٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلْخَـٰشِعِينَ ﴿٤٥﴾ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَـٰقُوا۟ رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿٤٦﴾

(۴۵)۔ اور صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو اگرچہ یہ مشکل اور بڑا کام ہے مگر خاشعین کیلئے نہیں۔ (۴۶) وہ (خاشعین) جو گمان رکھتے ہیں کہ اپنے رب کا سامنا کریں گے اور یہ کہ لازماً اُس کی طرف پلٹنا ہے۔

(۴۵-۴۶)۔ حق کے دفاع، حق پر عمل اور حق کی تلقین کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف صبر اور نماز کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں اور یہ کہ نماز اور صبر پر عمل پیرا ہونا ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہ شخص کر سکتا ہے جسے اللہ اور آخرت پر کامل یقین حاصل ہو اور یہ بھی یقین رکھتا ہو کہ وہ اپنے رب کے حضور پیش ہو گا اور جواب دہی کرے گا۔

يَـٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾ وَٱتَّقُوا۟ يَوْمًا لَّا تَجْزِى نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَـٰعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

(۴۷)۔ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تم کو نوازا اور تمہیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ (۴۸) اور اُس دن کا خوف کرو جب نہ کوئی کسی کی ذمہ داری اُٹھا سکے گا اور نہ ہی اُس کے بارے میں کسی کی سفارش قبول ہو گی، نہ فدیہ لیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی مدد ہو سکے گی۔

(۴۷)۔ بنی اسرائیل کو ایمان، جہاد، ہجرت، صبر اور موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے کی وجہ سے تمام دنیاوالوں پر فضیلت اور بالا دستی عطا کی گئی اور اُن کے ہاتھوں فرعون کی حکومت گرادی گئی۔ فرعون کے خزانے اور وسائل اُن کے ہاتھوں میں آ گئے اور لوگوں کی فکری اور اخلاقی قیادت اُن کے حصے میں آئی مگر بے صبری اور جہاد سے کنارہ کشی کے نتیجے میں یہ تمام افتخارات اُن کے ہاتھ سے چھن گئے۔

(۴۸)۔ دنیا میں جرائم پیشہ لوگ یا تو اِس وجہ سے سزا سے بچ جاتے ہیں کہ کوئی اور اُن کے اعمال کی ذمہ داری اُٹھالیتا ہے یا کوئی بڑی شخصیت اُن کی سفارش کر دیتی ہے یا جرمانہ دے دیتے ہیں اور یا کوئی مقتدر صاحب حیثیت شخص اُن کی مدد پر اُتر آتا ہے اور اُنہیں سزا سے بچالیتا ہے۔ اِس مبارک آیت میں منحرف دینداروں کو کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن نہ تمہارے وہ پیر، شیخ، اور پہنچی ہوئی شخصیات تمہاری شفاعت کر سکیں گی جن کے دامن تم نے تھام رکھے ہیں اور اُن سے شفاعت کی اُمیدیں باندھے ہوئے ہو۔ نہ تمہارا مال و دولت تمہیں بچا سکے گی، نہ تمہاری اپنی ایسی کوئی طاقت ہو گی اور نہ ہی اُن لوگوں کو اختیار و اِقتدار حاصل ہو گا جن پر تم تکیہ کئے ہوئے ہو۔ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت کے تمام گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا کر اُس کی پاداش میں صلیب پر چڑھائے گئے لہٰذا قیامت کے دن اِس قربانی کے طفیل آپؑ کی اُمت ہر قسم کی پوچھ گچھ اور سزا کے بغیر جنت میں داخل ہو گی۔ مذہب کی حقیقت سے بے خبر جاہل مذہب پرست ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ گمان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اُن کے شیخ، پیر اور مذہبی پیشوا اُن کو ہر قسم کے محاسبے اور سزا سے بچالیں گے۔ کہتے ہیں: ہم نے ایسی ہستی کا دامن تھام رکھا ہے جو ہمیں جنت میں لے جانے کی ذمہ دار ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی شفاعت کسی کے بھی گناہوں کی معافی کے لئے کافی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہی انحرافات پیدا ہو گئے تھے اس لئے تو اللہ تعالیٰ اُن سے فرماتا ہے کہ قیامت کے دن ایسی شفاعت، یا مدد حاصل نہیں ہو گی جو تمہیں اللہ کے محاسبے اور عذاب سے بچالے۔

وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾

(۴۹)۔ اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعونیوں سے تمہیں نجات دی، وہ تمہیں بدترین عذاب سے دوچار کئے ہوئے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اِس میں تمہارے لئے تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

---

(۴۹)۔ وہ بنی اسرائیل جن کو اپنے اقتدار کے زمانے میں مصر میں عزت اور اعتبار حاصل تھا اور سب اُن کے ساتھ احترام سے پیش آیا کرتے تھے، یوسف علیہ السلام کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ اِس مقام پر پہنچ گئے کہ فرعونی اُن کے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور بیٹیوں

کو زندہ رکھتے تھے تاکہ لونڈیاں بنا کر اُن سے خدمت لے سکیں۔ قرآن اِس بات کی صراحت کرتا ہے کہ فرعون، موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے بھی بنی اسرائیل کے بیٹوں کو اِس وجہ سے قتل کرتا تھا کہ کہیں اُن کی تعداد بڑھ نہ جائے اور وہ قبطیوں کے اقتدار کے لئے خطرہ نہ بن جائیں اور آپؐ کے بعثت کے بعد بھی اِس وجہ سے کہ کہیں اُن کے جوان موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شامل ہو کر بغاوت شروع نہ کر دیں۔ یہ ایک کمزور توجیہ ہے کہ فرعون نے خواب دیکھا تھا یا یہ کہ کاہنوں نے اُسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں کوئی بچہ ایسا پیدا ہونے والا ہے جو اُس کے تاج و تخت کیلئے خطرہ ہو گا لہٰذا اُس نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کے قتل کا فیصلہ کیا۔ پورے قرآن میں اِس دعوے کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اِس کے برعکس قرآن کے الفاظ اِس حوالے سے دوٹوک ہیں کہ فرعون، ہامان اور اُن کے تمام سردار بنی اسرائیل کے اقتدار میں آنے کے اندیشے میں مبتلا تھے۔ اُن کا یہ خوف اُس وقت اور بڑھ گیا جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس ہوئے، بنی اسرائیل کی آزادی کی بات کی اور فرعون سے مطالبہ کیا کہ اُن کو اُن کی مرضی سے جانے کا حق دیا جائے اور غلامی میں نہ رکھے جائیں۔ سورۃ القصص میں بڑی صراحت سے کہا گیا ہے کہ:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي ٱلْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِۦ نِسَآءَهُمْ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ مِنَ ٱلْمُفْسِدِينَ (۴)

بے شک فرعون نے زمین میں بڑائی کی اور اُس کے رہنے والوں کو گروہوں میں بانٹ دیا، جن میں سے ایک کو کمزور کر کے رکھتا تھا، اُن کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑتا تھا، یقیناً وہ مفسدوں میں سے تھا۔

ملاحظہ کریں یہاں صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ذبح کرنے کا ہدف اور مقصد بنی اسرائیل کا استضعاف اور اُن کو کمزور کرنا تھا۔ فرعون چاہتا تھا کہ کہیں یہ اکثریت میں آ کر اُس کے اقتدار کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ تعجب ہے کہ کوئی قرآن کی یہ وضاحت نظر انداز کرے اور ذبح کرنے کے لئے ایسے دلائل پیش کرے جو قرآن کے بھی خلاف ہیں اور عقل کے ساتھ بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔

قرآن کے نزدیک یہ فرعونی نظام کی ایک اساسی انفرادیت ہے کہ وہ مظلوم، ضعیف اور بے کس قوم کے اکثریت میں آنے سے خائف ہوتا ہے اور اُن کی تعداد گھٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے لیے (مستضعف) کی اصطلاح استعمال کی ہے، اِس لفظ میں یہ مطلب اپنے آپ لپٹا ہوا ہے کہ حاکم نظام اُن کو شعوری کوشش کر کے ضعف و ناتوانی میں مبتلا رکھے ہوئے تھا۔ یہ جو آج آپ مغرب اور خصوصاً امریکہ کو دیکھ رہے ہیں کہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ تیسری دنیا کی اقوام کو اپنی شرح پیدائش میں کمی کے لئے مجبور کر رہے ہیں اور اُن کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام میں لگے ہوئے ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ نفوس کی زیادتی فقر کا باعث بنتی ہے حالانکہ زمین میں رزق و روزی کے موجودہ وسائل اتنے وافر ہیں کہ موجودہ تعداد سے کئی گنا زیادہ لوگوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ معاشرے میں فقر و فاقہ کی وجہ لوگوں کی تعداد

اور وسائل کی دستیابی میں عدم تناسب نہیں بلکہ وسائل کی غیر عادلانہ تقسیم ہے۔ یہ مسئلہ طبقاتی نظام کا پیدا کردہ ہے، یہ مغرب کے سرمایہ دارانہ اور ظالمانہ اقتصادی نظام کی پیداوار ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے ظالمانہ تصرفات اور غیر عادلانہ تقسیم کا جنا ہوا مسئلہ ہے جس میں دولت کا بڑا حصہ محدود سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے اور اکثریت زندگی کی لازمی ضروریات سے بھی محروم ہے۔ اِن محرومین سے جھوٹ بولا جارہا ہے کہ تمہارے فقر وفاقہ کی وجہ تمہاری کثیر آبادی ہے، اپنی آبادی کم کردیں تاکہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ اُس زمانے کے فرعون اِن کے بچوں کو چھُری سے ذبح کرتے تھے مگر آج کے فرعون چند گولیاں دیکر اُنہیں ماں کے رحم ہی میں قتل کردیتے ہیں۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل کے عروج وزوال کے قصے میں اُن الٰہی سنن کی توضیح کی گئی ہے جو تاریخ میں ہمیشہ اور بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ دراصل اُن حوادث وواقعات کے تکرار کی ایک لمبی کہانی ہے جن کے نمونے بنی اسرائیل کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ہر زمانے کا ایک فرعون ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کی مانند ایک مجاہد۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اِن مجاہدین کی صفوں میں ہمیشہ ایک سامری پیدا ہوتا ہے جو مجاہدین کو اللہ کی بجائے بچھڑے کے مانند ایک جعلی اور کاذب معبود کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ زمانے کے ہر پڑاؤ پر آپ کو بلعم باعُور کی طرح دھوکے باز مذہبی پیشوا ملیں گے جو دین کو دنیا کے عوض بیچتے ہیں۔ آڑ مذہب کی لیتے ہیں مگر ساتھ اقتدار کا دیتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرتے ہیں۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ ٱلْبَحْرَ فَأَنجَيْنَـٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ ءَالَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٠﴾

(٥٠)۔ اور اُس وقت بھی جب ہم نے سمندر کو تمہارے لئے کھول دیا، تو تمہیں بچالیا اور فرعونیوں کو اِس حال میں غرق کردیا کہ تم اُن کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

---

(٥٠)۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنی وہ نوازشات یاد دلا رہا ہے کہ جب مصر سے نکلنے کے بعد اُن کے راستے میں سمندر حائل ہوا، پیچھے سے فرعون کا لشکر پہنچ گیا اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے کہ اب گھر چکے، آگے بھی نہیں جاسکتے اور لشکر کے مقابلے کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُسی سمندر میں سے اُن کے نکلنے کا راستہ کھول دیا اور فرعون کو لشکر سمیت اُس میں غرق کرکے اُن کا سب کچھ بنی اسرائیل کی میراث میں دے دیا۔ یہ بتا کر اللہ تعالیٰ مجاہدین کو اطمینان دلاتا ہے کہ حتمی بالادستی سے قبل ہو سکتا ہے کہ ایسی حالت سے واسطہ پڑ جائے کہ نجات کے تمام راستے بند نظر آئیں مگر اطمینان رکھیں کہ اِسی سخت حالت میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے دشمن کو اِنہی حالات میں شکست سے دوچار کرے گا۔

وَإِذْ وَٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾

(۵۱)۔ اور پھر وہ وقت جب موسیٰ کے ساتھ ہم نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر تم نے ظالم بن کر بچھڑے کو (معبود) بنایا۔(۵۲) پھر اُس کے بعد (باوجود) ہم نے تمہیں معاف کیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔

(۵۱-۵۲) بنی اسرائیل بلکہ ہر جاہل قوم کی ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ ایک صالح اور زعیم لیڈر کی موجودگی میں راہِ راست پر آتو جاتے ہیں مگر جونہی وہ سامنے سے تھوڑا ساہٹ جاتا ہے، گمراہ اور منحرف لیڈروں کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل بھی ایسے ہی تھے، موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے نتیجے میں نہ صرف اللہ پر ایمان لے آئے اور اس راستے میں ہر قسم کی مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنے بلکہ ہجرت کرنے پر بھی تیار ہو گئے مگر جونہی چند دنوں کیلئے موسیٰ علیہ السلام میقات کے لئے تشریف لے گئے، سامری کے گرد اکٹھے ہو گئے اور اُس کی اقتداء میں اور اُس کے کہنے پر بچھڑے کے آگے سجدے میں گر گئے۔ یہ جانوروں اور مویشیوں کی طرح ہیں، چرواہا جہاں چاہے انہیں لے جاتا ہے۔ اُن کا یہ جرم سخت محاسبے کے قابل تھا، اگر موسیٰ علیہ السلام نہ ہوتے اور اُس جھوٹے معبود کو گرا نہ دیتے اور سامری کو سزا نہ دیتے تو یہ اللہ کے بہت بڑے عذاب سے دوچار ہو جاتے مگر اللہ نے اُنہیں معاف کر دیا۔ اِس نعمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اللہ کے شکر گزار بندے بنتے اور کبھی بھی شرک اور عصیان کا راستہ اختیار نہ کرتے۔

وَإِذْ ءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

(۵۳) اور اُس وقت جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان دیا تاکہ تمہاری رہنمائی ہو۔ (۵۴) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: اے میری قوم! بے شک؛ بچھڑے کا انتخاب کرکے تم لوگوں نے اپنے اُوپر ظلم کیا پس اپنے رب کی طرف رجوع کرکے توبہ کرو اور اپنے لوگوں (مشرک نفوس) کو قتل کردو، یہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے، پس وہ تمہاری توبہ قبول کرلے گا، بے شک وہ بڑا مہربان اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(۵۳-۵۴) مصر سے نکلنے اور آزادی حاصل کرنے کے بعد اُن کو ایک ایسی رہنما کتاب کی ضرورت تھی جو اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم کر سکے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی جس میں ضروری احکام اور قوانین بھی تھے اور اچھے برے کی پہچان نیز مفید اور مضر کے درمیان فرق کرنے کے روشن اور واضح معیارات بھی تھے۔ اِسی کتاب کے مطابق اُنہیں حکم دیا گیا کہ سامری کی مطابعت اور بچھڑے کی پوجا کر کے اُنہوں نے اپنے آپ پر بڑا ظلم اور جفا کیا ہے اِس عظیم جرم کے کفارے کے طور پر چاہیئے کہ ایک بڑے جہاد پر کمربستہ ہو جائیں۔ کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کی بخشش کے لئے مجرد توبہ کافی نہیں ہوتی، ایسی توبہ کی اپنی شرائط اور لوازم ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا یہ جرم اتنا بڑا تھا کہ اُس کی توبہ اِس بات کے ساتھ مشروط کی گئی کہ وہ اسلحہ اُٹھائیں گے اور اُن لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان کریں گے جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا اور بچھڑے کو معبود بنایا تھا۔ جس طرح (و لا تخرجون انفسكم من دياركم) کی توضیح یوں کی گئی ہے کہ: (و تخرجون فريقاً منكم من ديارهم) اِس سے پتہ چلتا ہے کہ تقتلون انفسكم سے مراد اپنی قوم کے وہی مشرک افراد قتل کرنا ہے نہ کہ اپنا آپ۔ اِس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض حالات میں صرف گناہگاروں ہی کو نہیں بلکہ گناہ سرزد ہوتے ہوئے دیکھنے والوں کو بھی کفارہ دینا پڑتا ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ گناہ اُن افغانوں کے گناہ کی مانند ہے جو روسیوں کے خلاف جہاد کے بعد امریکیوں کے آگے جھک گئے اور اپنے ملک پر اُن کا اقتدار اور اُن کے جاری کردہ احکام تسلیم کر لیے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَـٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّـٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَـٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾

(۵۵)۔ اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ کو کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے، تو تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے (بجلی کی) کڑک نے تمہیں آلیا۔ (۵۶) پھر موت کے بعد ہم نے دوبارہ تمہیں زندہ کیا تاکہ شکر ادا کرو۔

(۵۵-۵۶)۔ چونکہ بنی اسرائیل جہاد پر تیار نہیں تھے لہٰذا اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا کہ تمہاری یہ بات ہم فقط اُس وقت مان سکتے ہیں جب اللہ کو رو در رو دیکھ لیں اور یہ ثابت ہو جائے کہ جہاد کا یہ حکم واقعی اُس کی طرف سے آیا ہے۔ وہ موت کے خوف سے جہاد سے پہلو تہی کر رہے تھے تو موت کا شکار ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنے فضل و کرم سے دوبارہ زندہ کیا۔ یہی اللہ کی سنت ہے کہ جو کوئی بھی موت کے خوف سے جہاد سے پہلو تہی کرتا ہے، ذلت کی موت مرتا ہے۔ اِس سورت میں اِس طرح کی

اور مثالیں بھی سامنے آئیں گی۔ سورت کی ابتداء میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب اُس شخص کے لئے رہنما بن سکتی ہے جس کی ایک صفت غیب پر یقین رکھنا ہوتا ہے۔ ملاحظہ کریں! بنی اسرائیل اِس کی بہترین مثال ہے، موسیٰ علیہ السلام سے کہتے ہیں: جب تک اللہ کو کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھیں گے تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْمَنَّ وَٱلسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَـٰتِ مَا رَزَقْنَـٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَـٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

(۵۷) اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور من و سلویٰ نازل کیا، کھاؤ اِن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں، اور اِن پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔

(۵۷) اِس آیت کے ذریعے نہ صرف بنی اسرائیل کو وہ نعمتیں یاد دلائی گئی ہیں جو ہجرت کے دوران اللہ تعالیٰ نے اُن پر کی تھیں۔ مصر سے شام کی طرف سفر کے دوران، سینا کے گرم اور بے آب و گیاہ صحرا میں اور اُس وقت جبکہ اُن کے خیمے بھی کٹے پھٹے تھے اور صحرا کی سخت گرم ہوا کے تھپیڑے بھی اُن کو جھلسائے جا رہے تھے؛ اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایسے بادل بھیج دیئے جو اُن کی پانی کی ضرورت بھی پوری کرتے تھے اور اُن پر سایہ بھی کئے رہتے تھے۔ بٹیروں کے جھنڈ کے جھنڈ آ کر اُن کے آس پاس بیٹھ جایا کرتے تھے جن کو وہ پکڑتے تھے اور ہر صبح صحرا کے پودوں پر ایسی ایک ذائقہ دار خوراک دانوں کی صورت میں لگی ہوتی تھی جسے وہ جمع کر کے کھاتے تھے۔ مگر اُن سے ہجرت کی اِس زندگی اور ایک ہی قسم کی خوراک پر صبر نہ ہو سکا، اسی بے صبری کی وجہ سے اِن نعمتوں سے محروم ہو کر فقر، بھوک اور ذلت کی زندگی میں پڑ گئے۔ بنی اسرائیل کے اِس قصے میں ہر مسلمان کو یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ: اگر وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرلے تو اُس کے رزق و روزی کا ضامن اللہ ہے۔ لیکن اگر بے صبری کا شکار ہو جائے اور آدھے راستے میں تھک ہار کر سفر کو اُدھورا چھوڑ دے تو اُنہی جیسے انجام سے دوچار ہو گا۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اپنے راستے کے مجاہد اور مہاجر پر تو کسی صورت بھی نہیں کرتا؛ کس طرح ممکن ہے کہ اُنہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے۔ بنی اسرائیل جس برے انجام سے دوچار ہوئے وہ اُن کے اپنے مظالم کی سزا تھی۔

وَإِذۡ قُلۡنَا ٱدۡخُلُواْ هَٰذِهِ ٱلۡقَرۡيَةَ فَكُلُواْ مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدٗا وَٱدۡخُلُواْ ٱلۡبَابَ سُجَّدٗا وَقُولُواْ حِطَّةٞ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطَٰيَٰكُمۡۚ وَسَنَزِيدُ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ قَوۡلًا غَيۡرَ ٱلَّذِي قِيلَ لَهُمۡ فَأَنزَلۡنَا عَلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ رِجۡزٗا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ بِمَا كَانُواْ يَفۡسُقُونَ ﴿٥٩﴾

(۵۸)۔ اور اُس وقت جب ہم نے کہا کہ: اِس بستی میں داخل ہو جاؤ اور جہاں سے چاہو بفراغت کھاؤ اور سجدہ کرتے ہوئے دروازے سے داخل ہو ؤ یہ کہتے ہوئے کہ "حطةٌ" (درگذر، گناہوں سے) تاکہ تمہارے گناہ بخش دوں اور نیکو کاروں کا(اَجر) بڑھادوں۔ (۵۹) لیکن اِن کے ظالموں نے بجائے وہ کچھ کہنے کے جو اُن کو کہا گیا تھا اپنا بیان بدل ڈالا پس ہم نے ظلم کرنے والوں پر اُن کے فسق کی پاداش میں آسمان سے اِضطراب کا عذاب نازل کیا۔

(۵۸-۵۹) بنی اسرئیل کو کہا گیا کہ دشمن پر حملے کیلئے تیار ہو جائیں، مگر خبر دار رہیں کہ فتح اور بالا دستی کے زعم میں غرور میں مبتلا نہ ہوں، مفتوحہ بستیوں میں مغرور فاتحین کی طرح داخل نہ ہوں اور تمہاری زبان سے میرے بتائے گئے کلمات کے علاوہ کوئی لفظ نہ نکلنے پائے۔ اپنی بالا دستی کو اپنے زورِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اِس کے برعکس اللہ کے مطیع اور ساجد بندوں کی مانند طرز عمل اپناتے ہوئے اور اللہ سے اپنے گناہوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر وہ اپنی کامیابی کے غرور میں مبتلا ہو گئے اور ظالم و مفسد فاتحین کا انداز اور نعرے اپنالئے۔ اِسی وجہ سے فتح اور بالا دستی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی خوشی، سکون اور اطمینان اُن کو نصیب نہ ہوا بلکہ پریشانی اور اِضطراب کا شکار ہو گئے ۔ اِس میں راہِ خدا کے مجاہدین کی نہایت اہم رہنمائیاں کی گئی ہیں۔ وہ یہ کہ فتح اور کامیابی کے بعد کبر و غرور سے اپنے آپ کو بچائیں، مفتوحہ علاقوں کے مکینوں کے ساتھ مغرور فاتحین کی طرح پیش نہ آئیں؛ نہیں تو تمہاری فتح اضطراب اور شکست میں بدل جائے گی۔

وَإِذِ ٱسۡتَسۡقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ فَقُلۡنَا ٱضۡرِب بِّعَصَاكَ ٱلۡحَجَرَۖ فَٱنفَجَرَتۡ مِنۡهُ ٱثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنٗاۖ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٖ مَّشۡرَبَهُمۡۖ كُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ مِن رِّزۡقِ ٱللَّهِ وَلَا تَعۡثَوۡاْ فِي ٱلۡأَرۡضِ مُفۡسِدِينَ ﴿٦٠﴾

(۶۰)۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کیلئے پینے کے پانی کی دعا مانگی، تو ہم نے کہا کہ: اِس پتھر پر اپنا عصا مارو، اِس طرح اُس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، پس ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کھاؤ اور پیئو اور زمین میں فساد پھیلانے والے نہ بنو۔

(۶۰)۔ اِن آیات میں اللہ کے راستے کے مجاہدین اور مہاجرین کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ اللہ تمہارے رزق و روزی کا ذمہ دار ہے۔ اگر وہ چاہے تو ٹھوس پتھر سے تمہارے لئے پانی نکال سکتا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح اُس نے بنی اسرائیل کے لئے سینا کے وسیع اور خشک صحرا میں ایک پتھر سے بارہ چشمے نکال دیئے۔ ہر قبیلے کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ چشمہ، تاکہ وہ پانی کے لئے آپس میں اُلجھ نہ پڑیں۔ اللہ تعالیٰ اُس قوم کو نہ صرف اطمینان اور وافر روزی کی ضمانت دیتا ہے جو ایمان لائے، دین کے تقاضوں کا التزام رکھے اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے کمربستہ ہو جائے بلکہ روزی کے لئے اُس کے آپس میں اُلجھنے کی روک تھام بھی کر لیتا ہے اور اُسے عزت و فراخی سے نواز دیتا ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَـٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى هُوَ أَدْنَىٰ بِٱلَّذِى هُوَ خَيْرٌ ۚ ٱهْبِطُوا۟ مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَـٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

(۶۱)۔ اور اُس وقت جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ایک ہی قسم کے خوراک پر ہم بالکل صبر نہیں کر سکتے!! پس اپنے رب سے ہمارے لئے دعا مانگو کہ ہمارے لئے وہ کچھ نکال لائے جو زمین سے اُگتا ہے۔ جیسے ساگ، سبزی، ککڑی، گیہوں، لہسن، دالیں اور پیاز وغیرہ تو اُس نے کہا: کیا اُس چیز کے بدلے میں جو بہتر ہے وہ کچھ مانگتے ہو جو حقیر ہے؟ کسی بستی میں اُتر جاؤ، تاکہ وہاں وہ چیزیں حاصل ہو جائیں جن کی تم نے خواہش کی، اور ذلت اور مسکنت اُن پر طاری کی گئی اور اللہ کے غضب میں مبتلا ہو گئے۔ یہ اِس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے، ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے تھے اور وہ بھی اِس لئے کہ عصیان میں مبتلا تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔

(۶۱)۔ اگر یہ اپنے حلال رزق پر قناعت نہ کریں اور اللہ کے راہ میں جہاد کے محاذ پر صبر کا مظاہرہ نہ کریں تو ذلت و خواری اور مسکنت سے دوچار کر دیئے جائیں گے۔ اِیسے لوگوں میں سب سے پہلے عصیان، دین کی حدود کو پامال کرنے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز و دست

درازی کی بیماری پھیل جاتی ہے۔یہ بیماری اِس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ پیغمبر اور حق پرست داعیوں کی راہ روکنے حتیٰ کہ اُن کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں اور اللہ کی آیات کا انکار کر دیتے ہیں۔اِس بات کو ذہن میں رکھیں کہ آدم علیہ السلام کے قصے میں بھی اپنے جائز رزق پر عدم اکتفاء اور شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانا جنت سے نکلنے کا باعث بنا اور اُسے (اھبطوا) کا حکم دیا گیا اور بنی اسرائیل کو بھی اِسی سبب سے کہا گیا (اھبطوا)۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے سقوط اور اعلیٰ درجوں سے تنزل کی ایک اساسی وجہ یہی بے صبری اور اپنے جائز رزق پر قناعت نہ کرنا ہے۔بنی اسرائیل کے اِس قصے میں وہ مطلب مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کی جنت میں سکونت اور پھر وہاں سے نکلنے کے قصے میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔یہ قصہ اُس کی تفصیل ہے اور اِس میں شجرِ ممنوعہ کی حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے۔یہ نہ تو کوئی پھل تھا اور نہ ہی کچھ اور ؛اِس کی دوسری ہر تعبیر بےبنیاد اور غلط ہے اور قرآن کی اِس تشریح سے ٹکراتی ہے۔شکی ذہنیتیں آدم علیہ السلام کی پیدائش،جنت میں سکونت،شجرِ ممنوعہ اور جنت سے اُترنے اور اِس قصے کے تمام تفصیلات سے وہ کچھ اخذ کر لیتی ہیں جو غیر طبیعی،خارق العادت اور آدمؑ کی اولاد سے متعلق ہر مشاہدے سے متناقض ہوتی ہے حالانکہ قرآن آدمؑ کے قصے میں ہمیں ہمارا تعارف کراتا ہے۔ہمیں چاہیے کہ اِس آئینے میں اپنی صورت دیکھ لیں اور انسان کے عروج وزوال کے عوامل سے آگاہی حاصل کریں۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلنَّصَٰرَىٰ وَٱلصَّٰبِـِٔينَ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

(٦٢)۔بے شک وہ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی بنے یا نصاریٰ اور صائبین،(جو کوئی بھی ہوں) اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو اُن کے لئے اپنے رب کے ہاں اَجر موجود ہے،اُن کو نہ تو کوئی خوف کرنا چاہیے اور نہ ہی وہ آزردہ ہوں گے۔

---

(٦٢)۔بات وہ نہیں ہے جو دین سے بے خبر لوگ سمجھے ہوئے ہیں،ناموں کی کوئی اہمیت نہیں،یہ نہیں دیکھا جاتا کہ تمہارا نام مسلمان،مسیحی یا صابئی ہے یا کچھ اور بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے اور عمل کس طرح۔مطمئن اور بے خوف وہ رہے جس کا ایمان درست اور عمل صالح ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُواْ مَآ ءَاتَيْنَٰكُم بِقُوَّةٍ وَٱذْكُرُواْ مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ

لَكُنتُم مِّنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ٱلَّذِينَ ٱعْتَدَوْا۟ مِنكُمْ فِى ٱلسَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً خَٰسِـِٔينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَٰهَا نَكَٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

(٦٣)۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لے لیا، طور کو تمہارے اوپر معلق کر کے کہ وہ کچھ مضبوطی سے تھام لو جو تمہیں دے دیا گیا اور جو کچھ اُس میں آیا ہے اُسے ہمیشہ یاد رکھو تا کہ تم پرہیز گار بنو۔ (٦٤) لیکن پھر اُس کے بعد تم نے روگردانی کی، تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور نوازش نہ ہوتی تو گھاٹا اُٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔ (٦٥) اور اپنے اُن لوگوں کو بھی تم نے خوب پہچان لیا ہے جنہوں نے ہفتے کے دن کی حدود پھلانگ دیں تو ہم نے اُنہیں کہا: ذلیل بندر بن جاؤ۔ (٦٦) تو یہ (واقعہ) ہم نے اگلے پچھلوں کے لئے عبرت کا ذریعہ اور متقین کے لئے نصیحت بنا دیا۔

(٦٣-٦٦)۔ جس طرح بنی اسرائیل سے اللہ کی کتاب پر تمسک اور اعتصام کا پختہ عہد اِس حال میں لیا گیا کہ کوہِ طور اُن کے سروں پر معلق کیا گیا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر اُس قوم کو جو ایمان کا دعویٰ رکھتی ہے مگر قدم قدم پر ایمان کے تقاضوں سے انحراف کرتی ہے؛ ایسے حالات سے دوچار کرتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اُن کے سروں پر معلق ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں وہ اللہ کے ساتھ مضبوط عہد باندھ لیتے ہیں اور دین کی طرف مائل ہو جاتے ہیں مگر جلد ہی یہ عہد بھول جاتے ہیں اور دوبارہ اپنی پہلے والی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے اُس قبیلے کی وضع اِس کی اچھی مثال ہے جو سمندر کے کنارے آباد تھا اور مچھلیوں کے شکار پر گذر بسر کرتا تھا۔ اُن کو کہا گیا کہ ہفتے کا دن عبادت کے لئے مخصوص کر لیں اور اُس دن شکار سے دور رہیں مگر اُنہوں نے مذہبی حیلہ تراش لیا۔ ہفتے کے دن مچھلیوں کو تالابوں میں گھیر لیتے تھے پھر اگلے دن اُن کو پکڑ لیتے تھے۔ وہ گمان کر رہے تھے کہ اِس طرح اپنے مذہب پر عمل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے، سبت کے دن کا احترام بھی پامال نہ ہوا اور مچھلیاں بھی پکڑ لیں۔

ہمارے لئے جمعے کا دن مقرر کیا گیا ہے کہ نماز کے وقت مسجد میں جمع ہوں گے خطبہ سنیں گے اور اِس خطبے اور نماز کے لئے گھڑی بھر کام کاج چھوڑیں گے۔ اِنہی الٰہی شعائر کے بابت کسی قوم کا احترام یا عدم احترام، دین کے لئے اُن کے التزام یا بے پروائی کی نشانی ہے۔ دین سے کسی قوم کے نکل جانے کی یہی نشانی ہے کہ وہ ایسے مبارک دنوں کا احترام پامال کرنے لگ جاتی ہے خصوصاً جب شعائر کا یہ عدم احترام مذہبی حیلے کے تحت ہونے لگے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةًۖ قَالُوٓا۟ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًاۖ قَالَ أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَۖ فَٱفْعَلُوا۟ مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَاۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ ٱلنَّٰظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ إِنَّ ٱلْبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ ٱلْأَرْضَ وَلَا تَسْقِى ٱلْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَاۚ قَالُوا۟ ٱلْـَٰٔنَ جِئْتَ بِٱلْحَقِّۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

(٦٧)۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، اُنہوں نے کہا: کیا ہمارا مذاق اُڑاتے ہو؟ اس نے جواب دیا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے بن جاؤں۔(٦٨) اُنہوں نے کہا: اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کرو کہ ہمارے لئے واضح کر دے کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا: وہ فرماتا ہے کہ یہ ایسی گائے ہے جو نہ بچی ہے نہ بوڑھی ہے بلکہ اس کے بیچ بیچ میں اور جوان ہے تو جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے کر گزرو۔(٦٩) کہنے لگے اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لئے واضح کر دے کہ اس کا رنگ کیسا ہے۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ یہ ایسی کھلتے ہوئے شوخ زرد رنگ کی ہے کہ دیکھنے والوں کو بھلی لگتی ہے۔(٧٠) کہنے لگے اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لئے واضح کر دے کہ یہ کیا ہے، ہمیں تو اِس گائے نے شک میں ڈال دیا ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت پالیں گے۔(٧١) اُس نے جواب دیا، وہ فرماتا ہے: یہ ایسی گائے ہے جو نہ کمزور ہے کہ ہل چلاتی رہی ہو اور نہ کھیتوں کے لئے پانی نکالتی ہے۔ ٹھیک ٹھاک کسی نقص کے بغیر ہے۔ اُنہوں نے کہا اب تم نے درست (حق) بات کہی، تو اُسے اس حال میں ذبح کیا کہ قریب تھا کہ نہ کر پائیں۔

(٦٧۔ ٧١)۔ یہاں بنی اسرائیل کے روپ میں اُن لوگوں کی حالت دکھائی گئی ہے جو اللہ کی عبادت کے اعلیٰ مقام سے گر کر ایک بچھڑے کی عبادت کی ادنیٰ اور پست سطح پر اُتر آتے ہیں اور پھر اُس جھوٹے معبود پر ایسی مضبوطی سے جم جاتے ہیں کہ اُس کے خلاف پیغمبر کی اُس بات کو ماننے میں بھی متامل ہوتے ہیں جس کا اُسے اللہ نے حکم دیا ہوتا ہے۔ ملاحظہ کریں کہ بنی اسرائیل نے

اُس اللہ کی جگہ جس نے اُن کی فرعون سے نجات کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی طرف بھیجا، ایک بچھڑے کا انتخاب کیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو کہا کہ: اِس بات کے اثبات کے لئے کہ آپ نے دوبارہ اللہ کی طرف رجوع کر لیا ہے اور بچھڑے کی عبادت سے کنارہ کش ہو گئے ہو؛ ایک گائے ذبح کر دیں تو وہ چونکہ دل سے اِس بات پر آمادہ نہیں تھے اِس لئے طرح طرح کے بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔ کبھی کہتے تھے ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو، اور کبھی یہ کہ گائے کی عمر کیا ہونی چاہیئے، اس کا رنگ کیسا ہو، اُس سے کوئی کام لیا گیا ہو یا نہیں؟ یہ سب فضول حیلے بہانے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ اُن کے دلوں میں اُس جھوٹے معبود کے لئے محبت اور احترام بدستور موجود تھا اور وہ اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ ہر جاہل اور مشرک قوم کی یہی وضع قطع ہوتی ہے، اپنے شرک پر جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ شیطان اُن کو اپنے جھوٹے اور جعلی معبودوں پر جمائے رکھتا ہے۔ ایمان کے جعلی مدعی بھی بنی اسرائیل کی طرح ہوتے ہیں، جب دین کے کسی ایسے صریح اور واضح حکم کو بجالانے کے لئے بلائے جاتے ہیں جو اُن کی نفسانی خواہشات کے ساتھ متصادم ہوتا ہے تو قسم قِسم کے حیلے بہانے تراشنے لگ جاتے ہیں اور اپنی روگردانی کے لئے قسم قِسم کی مذہبی توجیہات پیش کرنے لگ جاتے ہیں۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

(۷۲)۔ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا اور پھر اُس کے بارے میں اختلاف میں پڑ گئے اور اللہ اُس بات کو کھولنا چاہتا تھا جو تم چھپا رہے تھے۔ (۷۳) تو ہم نے کہا اُسے اِس کا ایک ٹکڑا مارو، اِسی طرح اللہ مردے زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

(۷۲۔ ۷۳) موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں دین سے دوری کی وجہ سے آپس میں قتل و غارت، مجرموں کا ساتھ دینے اور دوسروں پر تہمت اور بہتان رکھنے کی بیماری جڑ پکڑ چکی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا، قاتل کے قبیلے نے الزام کسی اور کے سر لگا دیا، قریب تھا کہ دونوں گھرانوں اور پھر دو قبیلوں کے درمیان ایک خونریز لڑائی چھڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا اِرادہ اس معاملے کو موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے حل کرنے کا تھا لہٰذا بنی اسرائیل کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اُنہوں نے کافی لیت و لعل کے بعد اِس کام کی حامی بھر لی اور گائے ذبح کر دی۔ اب اُنہیں کہا گیا کہ اِس گائے کے ایک حصے سے اُس مردے کو مارو۔ اِس طرح سے وہ مردہ چند لمحوں کے لئے زندہ ہوا اور اپنے قاتل کی نشاندہی کی۔ یوں ایک طرف

اُس خونریز لڑائی کا خطرہ ٹل گیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو عملاً دکھا دیا گیا کہ اُن کے اِس جھوٹے مقدس معبود کو ذبح کرنے سے اُن کے معاملات درست ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ اِس کی ہلکی سی بے احترامی بھی کسی بڑی مصیبت کے نازل ہونے کا سبب بنتی۔ یہ مبارک آیت ہمیں بتاتی ہے کہ صرف دین ہی لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور ایک کی دوسرے پر زیادتی کا مانع بنتا ہے۔ جہاں دین کا اِلتزام نہ ہو رہا ہو وہاں نہ لوگوں کی جان محفوظ ہو گی، نہ مال اور نہ ہی عزت۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دین کے علاوہ کسی دوسری چیز سے امن قائم ہو جائے اور ایک دوسرے پر زیادتی کی راہ روکی جا سکے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةًۚ وَإِنَّ مِنَ ٱلْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ ٱلْأَنْهَٰرُۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ ٱلْمَآءُۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ ٱللَّهِۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾

(۷۴)۔ پھر اِس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے اِس طرح جیسے پتھر ہوں بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت اور پتھروں میں سے تو بعض ایسے ہیں جن سے نہریں بہتی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اگر پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی بہہ نکلتا ہے اور بعض دوسرے پھر ایسے ہیں جو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں اور اللہ اُس سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔

---

(۷۴) اِس مبارک آیت میں ایک طرف توقسی القلب بنی اسرائیل کی اُس حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ لاش کے زندہ ہو جانے کے اُس عظیم واقعے سے بجائے ایمان لانے کے اُن کے دل مزید سخت ہو گئے۔ اتنے سخت جتنا کہ ایک پتھر ہوتا ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت جبکہ دوسری طرف اِس کے ذریعے ایک ایسی حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جسے انسان فقط بیسویں صدی میں قرآن کے نزول سے چودہ سو سال بعد بہت ساری علمی تحقیقات کے نتیجے میں جان سکا ہے۔ وہ یہ کہ سخت پتھروں کی ترکیب میں بھی پانی کے مالیکیول موجود ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت انسان پر تب آشکارہ ہوئی جب وہ ان پتھروں اور معدنیات کے کیمیائی تجزیئے کے قابل ہوا اور اُن کے ترکیب میں پانی کے مالیکیول ڈھونڈھ نکالے۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے قرآن نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے کہ پتھروں میں تو بعض ایسے ہیں جن سے نہریں بہتی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اگر ٹوٹ جائیں تو اُن سے پانی نکل آتا ہے!! جب قرآن یہ حقیقت بیان کر رہا تھا اُس وقت کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سخت پتھروں کی ترکیب میں پانی کے ذرات بھی ممکن ہو سکتے ہیں۔

تاہم یہ بات کہ قرآن یہاں پر خوفِ خدا سے بعض پتھروں کے گر پڑنے کی بات کرتا ہے، تو کیا واقعی پتھر احساس رکھتے ہیں یا پھر یہاں کوئی استعارہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مقصد فقط یہ بتانا ہے کہ پتھر بھی اپنے دلوں میں نرمی اور خوفِ خدا رکھتے ہیں مگر اہلِ کتاب کے علماء کے دلوں میں نہ کوئی ترّحم موجود تھا اور نہ ہی خوفِ خدا؟ واضح رہے کہ یہ پتھر جو بظاہر تمہیں بے شعور اور بے احساس نظر آتے ہیں اور پتھر دل اور بے رحم انسانوں کی اِن کے ساتھ تشبیہ دیتے ہو؛ درحقیقت ایسے نہیں ہیں بلکہ تم ہی مغالطے میں پڑ گئے ہو۔ یہ پتھر احساس رکھتے ہیں، اپنے رب کو پہچانتے ہیں اور کبھی کبھی خوفِ خدا سے ایسے لرز اُٹھتے ہیں کہ گر پڑتے ہیں۔ تمہارے وجود کا گوشت، پٹھے، مغز، خون اور عصبی ریشے اُس مٹی سے بنے ہیں جو کبھی سخت پتھر ہوا کرتی تھی مگر رفتہ رفتہ مٹی میں بدل گئی۔ اِسی خاک سے درخت، پودے، پھول، پھل اور غلے اُگ آئے جو تمہارے گوشت، خون، مغز اور عصبی ریشوں میں ڈھل گئے۔ اگر اِن پتھروں میں یہ کمال نہ ہوتا تو زندہ اجسام میں بدل جانا اِن کے لئے ممکن نہ ہوتا، اِن سے زندہ اجسام کبھی نہ بنتے۔ تمہیں تو شاید یہ پودے اور درخت بھی بے احساس لگ رہے ہوں، یہ حیوانات بھی بے شعور لگ رہے ہوں مگر کئی اعتبار سے یہ تم سے افضل ہیں۔ درخت کے تنے کو اگر آری سے کاٹ لو تو دیکھ لو گے کہ بہت جلد ایک لیس دار چکنے مائع سے وہ زخم ڈھک جائے گا جو اُسے جراثیم اور کیڑوں سے محفوظ کر لے گا۔ چند دن بعد یہ زخمی حصہ باقی صحت مند حصے سے زیادہ سخت ہو چکا ہو گا۔ کسی درخت کی ایک طرف کی کوئی شاخ کاٹ لو، چند دن بعد دیکھ لو گے کہ اس کے قریب ہی نئی کونپل نکل آئی ہے؛ یہ اِس لئے کہ درخت اپنا توازن برابر رکھنا چاہتا ہے تاکہ دوسری جانب جھک نہ جائے۔ کمرے کے اندر پودا رکھ لو چند دن بعد دیکھ لو گے کہ کھڑکی کی طرف مائل ہو گیا ہے اور اِس کوشش میں ہے کہ روشنی اور ہوا تک رسائی حاصل کر لے۔ ہر پودا جانتا ہے کہ زمین سے کونسی چیز جذب کر لے اور کس طرح اُس سے ایک محفوظ خول میں بند ذائقہ دار پھل اور غلہ بنا ڈالے جس کا دیکھنا بھی خوشگوار ہوتا ہے، سونگھنا بھی اور کھانے میں بھی لذیذ ہوتا ہے۔ تم اپنے تمام عقل و شعور اور علم و فن کے ساتھ اپنے تمام ترقی یافتہ وسائل کو کام میں لا کر بھی اِس چھوٹے سے پودے کی طرح کاریگری نہیں دکھا سکتے۔ شہد کی مکھی جو کچھ بناتی ہے اُس سے تمہاری تمام لیبارٹریاں مل کر بھی قاصر ہیں۔ بہت سارے حیوانات اپنے حواس میں تم سے آگے ہیں۔ جنگلی حیوانات، بلی، کتا، بکری، اور پرندوں کے دیکھنے، سننے اور سونگھنے کے حسّیات تم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ کئی حیوانات بارش، طوفان اور زلزلوں کا آنا تم سے کہیں قبل محسوس کر لیتے ہیں۔ تم بلاوجہ مغرور ہو اور اُنہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو۔

اِس بارے میں قرآن کا بیان نہایت ہی عبرتناک ہے۔ تاریخ کا سب سے عظیم تاجدار، سلیمان علیہ السلام، عظیم لشکروں کا مالک، وہی جس نے سب سے پہلے بادبانی کشتی بنائی؛ اُس چیز سے بے خبر تھا جو ایک ہدہد جانتا تھا۔ مملکتِ سبا اور اُس ملک کے رسم و رواج کی خبر اُنہیں ہدہد نے دی۔ اپنے لشکر کے ساتھ جا رہا تھا کہ اُن سے چند قدم آگے ایک (مادہ) چیونٹی نے دوسروں کو خبردار کیا کہ اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جائیں ایسے نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُن کا لشکر بے خبری میں تمہیں پیروں تلے روند ڈالے۔

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَتَوۡاْ عَلَىٰ وَادِ ٱلنَّمۡلِ قَالَتۡ نَمۡلَةٞ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّمۡلُ ٱدۡخُلُواْ مَسَـٰكِنَكُمۡ لَا يَحۡطِمَنَّكُمۡ سُلَيۡمَـٰنُ وَجُنُودُهُۥ وَهُمۡ لَا يَشۡعُرُونَ ﴿١٨﴾ النمل ١٨

یہاں (هم لا يشعرون) کی ترکیب نہایت دلچسپ اور خصوصی توجہ کے قابل ہے۔ تم اُن کو بے شعور سمجھتے ہو مگر وہ تمہارے عظیم سالار کے بارے میں کہہ رہی ہے کہ نا سمجھ ہیں۔

پتھر ہی نہیں بلکہ قرآن کائنات کی تمام چیزوں کا تعارف اِس طرح کراتا ہے کہ وہ طوعاً اور کرہاً اپنے رب کے آگے سر بہ سجود ہیں۔ نہایت انہماک کے ساتھ اپنی ماموریت اور حوالے کی گئی ذمہ داری بجالانے میں مصروف ہیں اور اِن میں سے ہر ایک اپنے رب کی تسبیح میں مشغول ہے مگر ہم اُن کی تسبیح کی ماہیت نہیں جانتے۔

پس قرآن کا یہ فرمانا حق ہے کہ بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ یہ پتھر، مٹی کے ڈھیلے، تمہارے ہاتھ پاؤں اور جسم کی کھال قیامت کے دن تمہارے سب کئے کرائے کی شہادت دیں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے سمجھنے کی پہلی سیڑھی پر آج سائنس قدم رکھنے والی ہے۔

أَفَتَطۡمَعُونَ أَن يُؤۡمِنُواْ لَكُمۡ وَقَدۡ كَانَ فَرِيقٞ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُونَ كَلَـٰمَ ٱللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُۥ مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴿٧٥﴾

(۷۵)۔ کیا تم یہ توقع کرتے ہو کہ یہ ایمان لے آئیں گے حالانکہ اِن کا ایک گروہ اللہ کا کلام سنتا ہے اور اُس کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اُس میں تحریف کرتا ہے اِس حال میں کہ خوب جانتے ہیں۔

---

(۷۵)۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل کے مذہبی پیشواؤں سے ایمان لانے کی توقع نہ رکھیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کا کلام سنا ہوا ہے، اُسے خوب سمجھ گئے ہیں لیکن اِس کے باوجود اُس میں تحریف کرتے ہیں اور اُس کی غلط تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو غلط کار اور ظالم حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُس میں سے طرح طرح کے فتوے نکالتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ایمان لانے کی توقع فضول ہے۔

وَإِذَا لَقُواْ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَالُوٓاْ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ إِلَىٰ بَعۡضٍ قَالُوٓاْ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ ٱللَّهُ عَلَيۡكُمۡ لِيُحَآجُّوكُم بِهِۦ عِندَ رَبِّكُمۡۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعۡلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعۡلِنُونَ ﴿٧٧﴾

(۷٦)۔ اور جب مسلمانوں سے سامنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں مگر جب آپس میں علیٰحدگی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا وہ کلام اِن کے ساتھ بانٹتے (share کرتے) ہو جو اللہ نے تم پر کھول دیا ہے، تا کہ اللہ کے سامنے تمہارے خلاف حجت قائم کرلیں، کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟ (۷۷)۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور جسے ظاہر کرتے ہیں۔

(۷٦۔۷۷)۔ اُن لوگوں سے جو اپنے آپ کو اہلِ کتاب اور صاحب علم کہتے ہیں مگر دین کو دکان بنائے ہوئے ہیں، دین کو دنیا کے عوض بیچتے ہیں، کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، مومنوں کے سامنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہمیشہ باطل کے پہلو میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں؛ یہ امید رکھنا کہ کبھی اللہ کے راستے کے مخلص داعیوں اور مجاہدین کا ساتھ دے دیں گے ایک بے بنیاد توقع ہے۔ یہ لوگ تو ہمیشہ اپنے دوستوں سے تخلیئے میں کہتے رہتے ہیں کہ کتاب کے اُن حصوں سے پردہ نہ اُٹھائیں جو تمہاری رسوائی کا باعث اور اللہ کے حضور تمہارے خلاف حجت بن سکتی ہیں۔ خبردار ایسا کرنا مخلص داعیوں اور مجاہدین کی بالادستی کا سبب بن جائے گا۔ اِن کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے چاہے یہ اُسے چھپائیں یا ظاہر کریں۔

وَمِنۡهُمۡ أُمِّيُّونَ لَا يَعۡلَمُونَ ٱلۡكِتَٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنۡ هُمۡ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيۡلٞ لِّلَّذِينَ يَكۡتُبُونَ ٱلۡكِتَٰبَ بِأَيۡدِيهِمۡ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنۡ عِندِ ٱللَّهِ لِيَشۡتَرُواْ بِهِۦ ثَمَنٗا قَلِيلٗاۖ فَوَيۡلٞ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتۡ أَيۡدِيهِمۡ وَوَيۡلٞ لَّهُم مِّمَّا يَكۡسِبُونَ ﴿٧٩﴾

(۷۸)۔ اور اِن میں سے بعض اُمی (ناخواندہ) ہیں، چند اندازوں (آرزوؤں) کے علاوہ کتاب میں سے کچھ نہیں جانتے اور یہ اپنے گمانوں ہی کی پیروی کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ (۷۹)۔ افسوس ہے اُن لوگوں کی حالت پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب

لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اُسے ایک حقیر قیمت کے عوض بیچ سکیں۔ افسوس ہے اِن کے ہاتھوں کی اِس لکھائی پر اور اُس قیمت پر جو یہ وصول کرتے ہیں۔

(۷۸۔۷۹)۔ اِن کے علماء اور اہلِ کتاب ایسے ہیں کہ خود سے گھڑ کر لکھ لیتے ہیں اور اپنے اغراض و امراض سے جنم لینے والے فتوے اللہ اور اُس کے دین کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مقصد اُن کا اِتنا ہی ہوتا ہے کہ کچھ مال، دو وقت کا کھانا، کوئی خلعت اور کوئی پگڑی یا شاباش حاصل کر لیں، دوسری طرف اِن کے عوام ایسے ہیں کہ کتاب اور اُس کی رہنمائیوں سے بے بہرہ ہیں۔ کتاب پر ایمان کے اِن کے دعوے کی اصل حقیقت فقط اتنی ہی ہے کہ چند جھوٹی اُمیدیں اور آرزوئیں اور کچھ گمان اور اندازے ہیں جن کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کی اُمیدیں یہ ہیں کہ جنت ملے گی جبکہ گمان یہ ہیں کہ کتاب اور الٰہی رہنمائیوں کے بارے میں اُن کا جو تصور ہے اور اپنے منحرف دینی علماء سے جو کچھ سنا ہوا ہے یہی حقیقت ہے اور یہی ہے اللہ کے دین کا اصل تقاضا۔ یہ دونوں گروہ (دھوکے باز اور دین فروش علماء اور دین سے بے بہرہ عوام) قابلِ افسوس ہیں مگر اصل مجرم اور افسوس کے قابل وہ علماء ہیں جو دین میں تحریف کرتے ہیں اور دنیوی کرنسی میں اُس کی قیمت لگاتے ہیں۔

وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعۡدُودَةً ۚ قُلۡ أَتَّخَذۡتُمۡ عِندَ ٱللَّهِ عَهۡدًا فَلَن يُخۡلِفَ ٱللَّهُ عَهۡدَهُۥٓ ۖ أَمۡ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَٰطَتۡ بِهِۦ خَطِيٓـَٔتُهُۥ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨١﴾ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلۡجَنَّةِ ۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨٢﴾

(۸۰)۔ اور اُنہوں نے کہا: آگ ہمیں نہیں چھو سکتی مگر چند دن، اِنہیں کہو کیا تم نے اللہ سے کوئی ایسا عہد لے لیا ہے جس عہد سے اللہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ یا اللہ کے بارے میں وہ کچھ کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے؟ (۸۱) ایسا نہیں ہے بلکہ جو کوئی برائی کرے گا اور اپنی غلطیوں کے حصار میں گھر جائے گا، تو وہی لوگ دوزخی ہیں اُس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۸۲) اور وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہ جنتی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۸۰۔۸۲)اِن آیات میں ایک جاہل قوم کے اُس غلط تصور کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ گردن تک گناہوں میں غرق ہوگی لیکن پھر بھی گمان رکھتی ہے کہ کوئی نہ کوئی حیلہ اُسے دوزخ سے بچالے گا اور اگر کہیں دوزخ جانا پڑ بھی جائے تو تھوڑے ہی عرصے کیلئے ہو گا۔یہاں صریح الفاظ میں بنی اسرائیل اور ہر کسی کے اِس غلط عقیدے کا رد کیا گیاہے جس کے تحت وہ ایمان اور عملِ صالح کے علاوہ کسی دوسری چیز کو دوزخ سے نجات اور جنت میں داخل ہونے کا سبب اور وسیلہ قرار دیتا ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾

(۸۳)۔ اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا کہ تم اللہ کے علاوہ کسی چیز کی عبادت نہیں کروگے اور ماں باپ اور رشتہ داروں،یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا سلوک کروگے اور لوگوں کے ساتھ بھلی بات کروگے اور نماز ادا کروگے اور زکوٰۃ دیا کروگے تو پھر تھوڑے لوگوں کے علاوہ تم سب نے منہ پھیر لیااِس حال میں کہ تم اِعراض کرنے والے تھے۔(۸۴)اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور ایک دوسرے کو گھر بار سے نہیں نکالو گے ، پھر تم نے اقرار کر لیااور حال یہ ہے کہ تم خود (اس قول و قرار کے) شاہد ہو۔

(۸۳۔۸۴)۔یہاں دین کے بنیادی تقاضوں سے منحرف ایک قوم کے اساسی انحرافات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ دین کی اساسی تقاضے یہ ہیں:صرف ایک اللہ کی عبادت،ماں باپ،رشتہ داروں،یتیموں اور مسکینوں کی مدد۔اگر احسان اور مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم بھلے طریقے سے لوگوں سے میل ملاپ، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی، ناحق خونریزی سے اجتناب اور مظلوموں کو اُن کے گھر بار سے نکالنے کی روک تھام توضرور کی جائے۔بنی اسرائیل نے ایمان لا کر اِن سب باتوں پر اللہ سے عہد باندھا مگر اپنے وعدے پامال کر لئے،اِن تمام دینی فرائض سے روگردانی کی اوراِس کے ساتھ ساتھ ایمان اور دینداری کے دعوے بھی کرتے رہے۔

ثُمَّ أَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَٰرِهِمْ تَظَٰهَرُونَ عَلَيْهِم بِٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَٰرَىٰ تُفَٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْىٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ ٱلْعَذَابِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُا۟ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ ٱلْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾

(٨٥)۔ پھر تم وہی لوگ ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اُن کے گھر بار سے بے دخل کرتے ہو، اُن کے خلاف ظلم اور سرکشی میں (ظالموں کے ساتھ) تعاون کرتے ہو، اور جب (یہی تمہارے بھائی) قیدی بن کر تمہارے پاس آجاتے ہیں تو تم فدیہ دے کر اُن کو چُھڑا لیتے ہو حالانکہ اُن کا تو نکالا جانا ہی تم پر حرام تھا۔ کیا کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ اور تم میں سے جو کوئی یہ کام کرے گا اُس کی سزا دنیا میں بھی رسوائی کے علاوہ کوئی نہیں اور قیامت کے دن وہ شدید عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔ (٨٦)۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کی قیمت (بدلے) میں دنیا کی زندگی خرید لی، تو نہ ہی اُن کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی اُن کی مدد کی جائے گی۔

(٨٥۔٨٦)۔ بنی اسرائیل اپنی ہی قوم کے بے کس اور بے بس مجبوروں پر ظلم کیا کرتے تھے، اُنہیں گھر بار سے بے دخل کر دیا کرتے تھے اور اُن کا خون بہانے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔ مگر اُن کے یہی ہم قوم جب دوسرے لوگوں کے ہاتھ لگ کر قیدی بن جاتے تھے تو اُن کی آزادی کے لئے چندے جمع کرتے تھے۔ یہ کام قومی تعصب کی بناء پر کیا جاتا تھا مگر اِس کو دینی اور مذہبی رنگ دیا جاتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ اُن سے فرماتا ہے کہ: کیا کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے کا کفر کرتے ہو؟

یہاں یہ نکتہ بھی انتہائی غور طلب ہے کہ کتاب پر عمل اور بے عملی کو کتاب پر ایمان اور کفر کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اِس کا معنٰی یہ ہے کہ کتاب پر ایمان کا اولین اور بنیادی تقاضا اُس پر عمل کرنا ہے۔ کتاب پر عمل نہ کرنے والے کا اُس پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی جھوٹا ہے۔

یہ آیات ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ ایک دیندار قوم کی ذلت اور رسوائی کا سب سے بڑا عامل کتاب کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کرنے کی روش ہوتی ہے۔

اِسی طرح یہ آیات ہمیں یہ بھی سمجھاتی ہیں کہ کتاب کے حصے بخرے کر کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کرنا دین کو دنیا کے عوض بیچ دینے والوں کا کام ہے۔ یہ لوگ دنیا اور آخرت میں الٰہی عذاب سے دوچار ہوں گے، کوئی چیز اُن کو اِس عذاب سے بچا نہیں سکے گی اور کوئی شخص یا کوئی طاقت اُن کی مدد نہیں کر سکے گی۔

وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَـٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنۢ بَعْدِهِۦ بِٱلرُّسُلِ ۖ وَءَاتَيْنَا عِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ٱلْبَيِّنَـٰتِ وَأَيَّدْنَـٰهُ بِرُوحِ ٱلْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

(۸۷)۔ اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی اور اُس کے بعد مزید انبیاء بھیجے اور عیسیٰ مریم کے بیٹے کو کھلی نشانیاں دے کر روح القدس کے ذریعے اُس کے ہاتھ مضبوط کئے، تو کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس وہ کچھ لے کر آیا جو تمہارے نفس کو ناپسند تھا تو تم کبر و نخوت کے ساتھ پیش آئے اور بعض کی تکذیب کی اور بعض کو قتل کرتے رہے۔

---

(۸۷)۔ پیغمبروں اور خدا ترس داعیوں کے ساتھ مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خود غرض اور نفس پرست ہویٰ و ہوس کے بندوں کو اُن کی پکار اور دعوت اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی مخالفت کی وجہ حقیقت سے ناواقفیت نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ کہ داعی اُن کے سامنے کافی اور قانع کرنے والے دلائل پیش کرنے میں ناکام ہو گئے ہوتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس کتنی واضح نشانیاں لے کر آئے تھے مگر بجائے ایمان لانے کے اُن کے قتل کے درپے ہوئے؛ اُن کے حواریوں کو سولی پر چڑھایا، آگ میں جھونک دیا اور اُن کی تعذیب میں کسی جرم سے دریغ نہ کیا۔

وَقَالُوا۟ قُلُوبُنَا غُلْفٌۢ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ ٱللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

(۸۸)۔ اور کہنے لگے: ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اِن کی کفر کی وجہ سے اللہ نے اِن پر لعنت بھیجی ہے تو یہی وجہ ہے کہ اِن میں سے تھوڑے ہی ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

(۸۸)۔ اُن کے ضدی علماء کہا کرتے تھے: ہمارے اوپر تمہاری تبلیغ اثر نہیں کر سکتی۔ ہمارے دل علم کے خزانے ہیں اور ہمارے اور تمہارے بیچ دبیز پردے حائل ہیں۔ اِس ضد اور مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے کافرانہ عقائد اور رنگ ڈھنگ کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اُن کو دھتکار دیا تھا اور وہ لعنت کے مُستحق ٹھہر گئے تھے۔ یہی ایمان کی دولت سے اُن کی محرومی کا سبب تھا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَـٰبٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا۟ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا۟ كَفَرُوا۟ بِهِۦ ۚ فَلَعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا ٱشْتَرَوْا۟ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۖ فَبَآءُو بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَـٰفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾

(۸۹)۔ اور جب اللہ کی طرف سے اِن کے پاس ایک ایسی کتاب آگئی جو اِن کے پاس پہلے سے موجود (کتاب) کی تصدیق کرنے والی تھی اور اُس سے قبل یہ اُس (ایسی ہی ایک کتاب کی نزول) کے ذریعے کافروں پر بالا دستی کے خواہش مند تھے مگر جب وہی چیز اِن کے پاس آگئی جسے یہ خوب جانتے بھی تھے، تو اُس کے کافر ہو گئے۔ پس اِن کافروں پر اللہ کی لعنت ہو۔ (۹۰) کتنا بُرا ہے وہ کچھ جس کے بدلے اِنہوں نے خود کو بیچ ڈالا، اِنہوں نے بغاوت کرتے ہوئے ما انزل اللہ سے کفر کا ارتکاب کیا، اِس لئے کہ کیوں اللہ نے اپنے بندوں میں سے (اِن کو چھوڑ کر) جس پر اُس کی مرضی تھی اپنے فضل اور نوازش میں سے کچھ نازل کیا۔ لٰہذا اللہ کے پے بہ پے غضب میں گرفتار ہوئے اور اِن کافروں کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

(۸۹۔۹۰)۔ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے قبل وہ ہمیشہ بے قراری کا اِظہار کیا کرتے تھے کہ کاش ایک مرتبہ پھر اُن میں ایک پیغمبر مبعوث ہو جائے جو کافروں کی بالا دستی سے اُن کو نجات دلا دے۔ مگر جب پیغمبر علیہ السلام مبعوث ہوئے اور اپنے ساتھ وہی کچھ لے آئے جو آپؐ سے قبل انبیاء لائے تھے اور بنی اسرائیل خوب جان گئے کہ یہ اُن کے اصل دین کی مانند ہے تو ایمان لانے سے اِس لئے رُک گئے کہ یہ پیغمبر اُن کی قوم میں سے نہیں تھا۔ اُن کی مذہبی قیادت اور اُن کے وہ فائدے جو وہ دین کے نام پر بہکائے گئے (misguided) مذہبی عوام سے حاصل کرتے تھے، خطرے میں پڑ گئے۔ یوں یہ پیغمبر علیہ السلام کی

مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے پے بہ پے غضب کے مستحق قرار پائے۔ ایک تو پہلے والی کتاب کی مخالفت کی وجہ سے اور اب اس نئی کتاب کی مخالفت کے سبب سے بھی۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُواْ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُواْ نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ وَهُوَ ٱلْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنۢبِيَآءَ ٱللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ ۞ وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسَىٰ بِٱلْبَيِّنَٰتِ ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾

(۹۱)۔ اور جب اِنہیں کہا جاتا ہے: جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اُس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں: ہم اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی ہے اور اُس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کرتے ہیں، اگرچہ وہ حق ہے اور اِن کے ساتھ موجود (کتاب) کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ا نہیں کہو: اگر تم ماننے والے تھے تو اِس سے قبل اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے تھے؟ (۹۲) یقیناً موسیٰ (علیہ السلام) کھلی نشانیاں لے کر تمہارے پاس آئے مگر اُس کے بعد تم نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا، اِس حال میں کہ تم ظالم تھے۔

(۹۱۔۹۲)۔ ہر صالح داعی کو جن بڑی بڑی رکاوٹوں سے واسطہ پڑتا ہے اُن میں سے ایک قومی تعصب ہے جو کبھی کبھی مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور مذہب ایک مخصوص گروہ اور قوم کے ہاتھ میں ناجائز سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی امتیازات حاصل کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہ گروہ پھر ہر دعوت کا مقابلہ مذہب کے ہتھیار سے کرتا ہے چاہے وہ دعوت اِن کے اپنے مذہب سے قریبی مماثلت ہی کیوں نہ رکھتی ہو اور اِن کے اصل مذہب کی تائید اور تصدیق ہی کیوں نہ کرتی ہو۔ بنی اسرائیل کے مذہبی پیشوا خوب جانتے تھے کہ قرآن وہی کچھ کہتا ہے جو تورات میں ہے اور محمد ﷺ وہی دعوت دیتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کا مشن تھا مگر اِس کے باوجود ہر کسی سے بڑھ کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ اِن کے جواب میں کہا جارہا ہے کہ: اسلام کے ساتھ تمہاری یہ مخالفت نہ اللہ کے لئے ہے نہ تورات کے لئے اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام کے لئے۔ تم وہی لوگ ہو جو اِس سے قبل موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور تورات اور انجیل کی مخالفت کر چکے ہو۔ یہ کونسا ایمان ہے جس میں بچھڑے کی عبادت کی جاتی ہے؟

وَإِذۡ أَخَذۡنَا مِيثَـٰقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُواْ مَآ ءَاتَيۡنَـٰكُم بِقُوَّةٍ وَٱسۡمَعُواْ‌ۖ قَالُواْ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا وَأُشۡرِبُواْ فِى قُلُوبِهِمُ ٱلۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ‌ۚ قُلۡ بِئۡسَمَا يَأۡمُرُكُم بِهِۦۤ إِيمَـٰنُكُمۡ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿٩٣﴾

(۹۳)۔ اور جب کوہِ طور کو تمہارے اوپر معلق کر کے ہم نے تم سے پختہ عہد لے لیا (اور ہم نے کہا) کہ: غور سے سنو اور جو کچھ تمہیں دیا جارہا ہے اِسے مضبوطی کے ساتھ پلے باندھ لو، تو اُنہوں نے کہا: ہم سن رہے ہیں مگر مان کر نہیں دیتے تو اُن کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کو اُن کے دلوں میں بسایا گیا۔ اِنہیں کہو: کہ تمہارا یہ ایمان تمہیں کیا ہی بُرا حکم دیتا ہے، اگر تم مومن ہو۔

(۹۳)۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اِس حال میں کہ کوہِ طور اُن کے اوپر معلق تھا، کئے گئے وعدے اُنہوں نے توڑ ڈالے۔ اُس حال میں بھی یہ لوگ زبانوں پر اقرار و اطاعت کے الفاظ مگر دلوں میں عصیان کا قصد و ارادہ لئے ہوئے تھے۔ یہی عہد و پیمان تھا جس کے بعد اُنہوں نے جعلی معبود تراش لیا۔ اس لئے اُن کو کہا گیا ہے کہ تمہارے یہ تمام نامناسب اعمال اگر کسی ایمان یا عقیدے کے تحت انجام دیئے جارہے ہیں تو یہ تو پھر ایک بہت ہی گندہ ایمان اور بُرا عقیدہ ہے جو اِیسے بُرے اعمال پر اُبھارتا ہے۔

قُلۡ إِن كَانَتۡ لَكُمُ ٱلدَّارُ ٱلۡأَخِرَةُ عِندَ ٱللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ ٱلنَّاسِ فَتَمَنَّوُاْ ٱلۡمَوۡتَ إِن كُنتُمۡ صَـٰدِقِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَن يَتَمَنَّوۡهُ أَبَدَۢا بِمَا قَدَّمَتۡ أَيۡدِيهِمۡ‌ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمُۢ بِٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمۡ أَحۡرَصَ ٱلنَّاسِ عَلَىٰ حَيَوٰةٍ وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشۡرَكُواْ‌ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ أَلۡفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهِۦ مِنَ ٱلۡعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ‌ۗ وَٱللَّهُ بَصِيرُۢ بِمَا يَعۡمَلُونَ ﴿٩٦﴾

(۹۴)۔ اِنہیں کہو: کہ اللہ کے ہاں آخرت کا گھر؛ اگر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو موت کی تمنا کرو اگر سچے ہو۔ (۹۵) اور یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے بوجہِ اپنے آگے بھیجے گئے کرتوتوں کے، اللہ اِن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۹٦) اور تم اِن کو ہر کسی سے زیادہ زندگی کا حریص پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ۔ اِن میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ کاش وہ ہزار سال جیتا رہے مگر عمر کی یہ طوالت اِن کو عذاب سے نجات دلانے والی نہیں اور اللہ اِن کے کرتوتوں کو اچھی طرح دیکھنے والا ہے۔

(۹۴۔۹۶)۔ باوجود اپنے تمام شرک، عصیان، جہاد سے فرار، ظالموں کی حمایت اور انبیاء وحق پرستوں کی مخالفت کے، اِن کا گمان تھا اور یہی اِن کے مذہبی پیشواوں نے اُنہیں بتایا تھا کہ جنت صرف اِن کے لئے پیدا کی گئی ہے اور یہ جنت کے لئے۔ اسی کے جواب میں کہا گیا ہے: کہ اگر امر واقعی یہی ہے تو پھر تو تمہیں موت سے خوفزدہ بالکل نہیں ہونا چاہیئے اور اللہ کی راہ میں شہادت کیلئے بے قراری کی شمع ہمیشہ تمہارے دل میں روشن رہنی چاہیئے مگر یہ موت کا خوف کیوں؟ تمہارے مذہبی پیشواوں میں سے کوئی جنگ کے مورچے میں نظر کیوں نہیں آرہا؟ ہمیشہ اپنے پیغمبروں کو جہاد میں اکیلا کیوں چھوڑتے رہے ہو؟ اِس طرزِ عمل سے ٹپک تو یہی رہا ہے کہ اپنے دعوے پر یقین نہیں رکھتے۔ اِن آیات میں اور اِن کی مانند کئی دوسری آیات میں بھی موت کا خوف، لمبی زندگی کی تمنا، اور اللہ کی راہ میں شہادت سے پہلو تہی اُس قوم کی نشانیاں قرار دی گئی ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹی ہوتی ہے، جس کو نہ تو آخرت اور جنت پر یقین ہوتا ہے اور نہ ہی اس بات پر کہ زندگی اور موت کے فیصلے اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

قُلۡ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيلَ فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلۡبِكَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدًى وَبُشۡرَىٰ لِلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَجِبۡرِيلَ وَمِيكَىٰلَ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَدُوٌّ لِّلۡكَٰفِرِينَ ﴿٩٨﴾

(۹۷)۔ کہو: جو کوئی جبرائیل سے دشمنی کرتا ہے، تو اُس نے تو اللہ کے اِذن اور حکم سے مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت اور ماقبل کی تصدیق کرنے والا (قرآن) تمہارے دل پر اُتارا۔ (۹۸) تو جو کوئی اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کے پیغمبروں، جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو (جان لو کہ) اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

(۹۷۔۹۸) یہود کہا کرتے تھے کہ: محمد ﷺ جس جبرائیل کے بارے میں کہتا ہے کہ آپؐ پر وحی لے کر آتا ہے، اُس نے ہمیشہ ہمارے (یہودیوں کے) ساتھ دشمنی کی ہے اور ہماری قوم پر تمام عذاب اُسی کے ہاتھوں نازل ہوتے رہے ہیں۔ اب یہ تو اُس نے دشمنی کی انتہا کر دی کہ یہود کو نظر انداز کر کے وحی کا پیغام کسی اور کے پاس لے آیا!! اِن کے جواب میں کہا گیا ہے کہ جبرائیلؑ کے ساتھ دشمنی دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی ہے۔ اُس نے تو اِس کے علاوہ کچھ نہیں کیا کہ اللہ کے حکم سے محمد ﷺ تک کتاب پہنچا دی ہے اور کتاب بھی وہی جو تمہاری اور پچھلی تمام کتابوں کی تائید کرتی ہے۔ اِس کتاب کی مخالفت دراصل تورات اور انجیل کی مخالفت ہے۔ اِس کتاب اور اِس کی روشن آیات سے تمہارے انکار کی بڑی وجہ تمہارا فسق وفجور ہے۔ گناہوں میں لتھڑے ہوئے تمہارے دل، اِن واضح نشانیوں کے ماننے اور تمہارا ایمان لانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

وَلَقَدْ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ءَايَٰتٍۭ بَيِّنَٰتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا ٱلْفَٰسِقُونَ ﴿٩٩﴾

(۹۹)۔ اور یقیناً ہم نے تمہاری طرف واضح نشانیاں اُتاریں، (اتنی واضح) کہ فاسقوں کے علاوہ اُن کا انکار کوئی نہیں کرتا۔

(۹۹)۔ جس طرح اِس سے قبل انبیاء کو ہم نے واضح نشانیاں اور معجزے دیئے تھے مگر بنی اسرائیل نے اُن سب کا انکار کر دیا، اِسی طرح تمہیں بھی ہم نے ایسی واضح نشانیاں دی ہوئی ہیں جن کا انکار فاسقین کے علاوہ اور کوئی نہیں کرتا۔ یعنی انکار کرنے والوں کے انکار کی وجہ دلائل اور شواہد کی کمی نہیں بلکہ اُن کا اپنا فسق ہے۔

أَوَكُلَّمَا عَٰهَدُوا۟ عَهْدًا نَّبَذَهُۥ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ وَٱتَّبَعُوا۟ مَا تَتْلُوا۟ ٱلشَّيَٰطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَٰنَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَٰنُ وَلَٰكِنَّ ٱلشَّيَٰطِينَ كَفَرُوا۟ يُعَلِّمُونَ ٱلنَّاسَ ٱلسِّحْرَ وَمَآ أُنزِلَ عَلَى ٱلْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَٰرُوتَ وَمَٰرُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِۦ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَزَوْجِهِۦ ۚ وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِۦ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا۟ لَمَنِ ٱشْتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَٰقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا۟ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ ءَامَنُوا۟ وَٱتَّقَوْا۟ لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا۟ يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾ (۱۰۰)۔ اور جب کبھی اِنہوں نے کوئی عہد کیا ہے تو اِن میں سے ایک گروہ نے اُسے پسِ پشت ڈال دیا ہے بلکہ اِن میں سے اکثریت ایمان نہیں رکھتی۔ (۱۰۱) اور جب کبھی اللہ کی طرف سے ایسا کوئی پیغمبر اِن کی طرف بھیجا گیا ہے جو اِن کے ساتھ موجود (کتاب) کی تصدیق کرنے والا ہوتا تھا تو اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اِس طرح پسِ پُشت ڈال دیا گویا کہ (وہ کچھ) نہیں جانتے تھے۔ (۱۰۲) اور اُس چیز کی متابعت کرنے لگے جو شیطان سلیمان (علیہ السلام) کی بادشاہی (کے بارے) میں پڑھا کرتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کفر کی راہ اختیار نہیں کی تھی بلکہ یہ شیطان خود ہی کافر ہو گئے تھے، لوگوں کو جادو اور وہ کچھ سکھایا کرتے تھے جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا تھا۔ یہ (فرشتے) کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے

جب تک سمجھا نہیں دیتے تھے کہ: ہم تو آزمائش (امتحان کیلئے) ہیں لہٰذا تم کفر میں نہ پڑنا۔ مگر یہ (اس کے باوجود) اُن دونوں سے وہ کچھ سیکھا کرتے تھے جس کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے تھے حالانکہ بغیر اللہ کے حکم کے یہ کسی کو نقصان پہنچا سکنے پر قادر نہ تھے اور (چیزیں بھی) وہ سیکھتے تھے جو اُن کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھیں، وہ بلاشبہ یہ بھی جانتے تھے کہ جو بھی یہ سودا کرتا ہے آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یقیناً انہوں نے اپنی بہت بُری قیمت لگالی، کاش انہیں سمجھ ہوتی۔(۱۰۲)۔ اگر یہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کی طرف سے ملنے والا ثواب بہت بہتر ہے کاش اِنہیں سمجھ ہوتی۔

(۱۰۰۔۱۰۳)۔ یہاں بنی اسرائیل کے تناظر میں ایک دیندار مگر حق سے برگشتہ قوم کے چند اہم انحرافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: اپنے وعدوں کا پاس نہ رکھنا، اللہ کی کتاب کو اِس طرح پسِ پُشت ڈال دینا جیسے کچھ سمجھ نہ آتا ہو اور اُس کے بجائے تعویذ گنڈوں اور جادو کے پیچھے پڑ جانا۔ یہ اور ایسے دوسرے کام نہ صرف جائز سمجھنا بلکہ سلیمانؑ کے عظیم اقتدار (جس کی کوئی مثال تاریخ میں موجود نہیں ہے) کو آپؑ کے اور آپؑ کے مجاہد والد داؤد علیہ السلام کے جہادِ عظیم کے بجائے ایک جادوئی انگوٹھی اور کچھ جنتر منتر کا حاصل قرار دینا۔ آخر کار ان کا بڑا کمال تعویذ گنڈے کر کے شوہر اور بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا کرنا رہ جاتا ہے۔ بنی اسرائیل بھی آہستہ آہستہ اللہ کے دین سے دور ہوتے گئے، اُن میں فکری اور اخلاقی انحرافات پیدا ہوتے گئے، اخلاقی لحاظ سے پستی کے اُس انتہائی درجے تک گر گئے کہ ایک دوسرے کی عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے گھات میں بیٹھ جانے اور اِس کوشش میں رہنے لگے کہ کس طرح اپنے لئے دوسرے سے اُس کی بیوی علیحدہ کر لیں۔ یوں اُنہوں نے اللہ کی کتاب کو پسِ پُشت ڈالا اور جادو اور تعویذ گنڈوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اِتمام حجت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف دو فرشتے انسانی شکل و صورت میں بھیج دیئے تاکہ اِن کے انحرافات، جاہلانہ رسوم اور کافرانہ مشغولیتوں کی اصلاح کریں۔ وہ اُن کو سمجھاتے رہے کہ جادو، ٹونوں اور تعویذ گنڈوں کو اختیار کر کے کافر نہ بنیں، جواب میں وہ فرشتوں سے بھی وہی کچھ سکھانے کی فرمائش کرنے لگے جس کے ذریعے بیوی کو اُس کے شوہر سے جدا کیا جا سکے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقُولُواْ رَٰعِنَا وَقُولُواْ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُواْ ۗ وَلِلْكَـٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

(۱۰۴)۔ اے مومنو! راعنا (ہماری رعایت کیجئے) نہ کہو، اُنظرنا (ہم پر نظر کیجئے) کہا کرو اور غور سے سنا کرو اور اِن کافروں کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔

(۱۰۴)۔ یہود پیغمبر علیہ السلام کی مجلس میں اُن کو مخاطب کرنے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جو بظاہر تو اچھے مفہوم کے حامل ہوتے تھے مگر زبان کی ذراسی جنبش سے بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے اور نہایت غلط مفہوم کے حامل بن جاتے تھے۔ مثلاً راعنا کو زبان کی تھوڑی سی جنبش سے راعینا کر دینا جس سے اِس کا مطلب بدل کر "ہمارا گڈریا" ہو جاتا ہے۔ یہود کے ہاں ناسمجھ اور بے عقل کا مفہوم بھی اِس لفظ میں مضمر ہو تا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو کہا گیا کہ بات چیت میں ایسے الفاظ استعمال کریں جو واضح اور صاف مفہوم ادا کرتے ہوں۔ دو رنگی اور ذو معنی الفاظ کا استعمال؛ اِن دونوں چیزوں سے اجتناب کریں۔ اِسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی محفل میں اُن کے ارشادات کو اِس طرح غور سے سنیں کہ پوچھنے کا احتمال ہی باقی نہ رہے۔ ہر بات ایک ہی مرتبہ سن کر بھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح آئی ہوئی ہونی چاہیئے۔ راعنا کہنے کی ضرورت تو پڑتی ہی اُن لوگوں کو ہے جو غور سے بات نہیں سنتے۔

مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَلَا ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾ ۞ مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٦﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٠٧﴾

(۱۰۵)۔ نہ تو کافر اہلِ کتاب اور نہ ہی مشرکین کو یہ گوارا ہے کہ تمہارے اوپر اللہ کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔ حالانکہ اللہ اپنی نوازشات کے لئے مستحق کا فیصلہ اپنی ہی مرضی سے صادر فرماتا ہے اور وہ تو بہت ہی بڑے فضل کا مالک ہے۔ (۱۰۶) ہم اگر کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں اور یا تمہاری یاداشت سے محو کرتے ہیں تو (اُس کے بدلے) یا تو اُس کی مانند اور یا اُس سے بہتر آیت لے آتے ہیں۔ کیا جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔؟ (۱۰۷) کیا جانتے نہیں ہو کہ آسمانوں اور زمین پر حکمرانی اللہ کی ہے اور یہ کہ اللہ کے علاوہ نہ تمہارا کوئی مالک ہے اور نہ مددگار۔

(۱۰۵۔۱۰۷)۔ اہلِ کتاب مسلمانوں پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ ایسے کیوں ہے کہ قرآن میں ایسے احکام آئے ہیں جو بعد میں منسوخ ہو گئے ہیں اور اُن کی جگہ نئے احکام نازل ہو گئے ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ ابتداء میں آنے والی بعض ہدایات آہستہ آہستہ مکمل طور پر بھلا دی گئی ہیں؟ تورات جو اللہ کی کتاب ہے اُسے چھوڑ کر کیوں ایک نئی کتاب لائی جائے؟ اللہ تو ماضی اور مستقبل کا یکساں علم رکھتا ہے اُس نے کب ایسی ہدایات دی ہوں گی جو بعد میں بدلنی پڑ جائیں؟ وہ عام مسلمانوں سے ایسے اور اِس کی مانند

اور دوسرے سوالات پوچھا کرتے تھے جن کا مقصد اُن کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنا ہوتا تھا۔ راسخ العقیدہ اور سمجھدار مسلمان تواُن کو جواب دے دیا کرتے تھے مگر ایسے لوگ جن کو اسلام قبول کئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہوتا تھا ایسے سوالات سے متاثر ہو جایا کرتے تھے اور پیغمبر علیہ السلام سے اِن کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ اِن آیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی اِن سوالات کے بارے میں کچھ رہنمائی کی گئی ہے۔ یہ بات مدِ نظر رکھیں کہ یہ جوابات براہِ راست پوچھنے والوں (زیادہ تر یہود) کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو مخاطب کرکے دیئے گئے ہیں۔ فرمایا گیاہے کہ:

- اگر اللہ کوئی آیت منسوخ کرتاہے یااُس کے بھول جانے اور چھوڑ دینے کا حکم دیتاہے تو یاتواُس سے بہتر یااُس کی مانند دوسرا، مسلمانوں کے زیادہ مناسبِ حال حکم صادر کردیتاہے۔ حالات کے تقاضے اور انسان کی وضع بدلتی رہتی ہے لہٰذا فیصلہ اِس بنیاد پر نہیں ہوناچاہیئے کہ ایک حکم کے بدلے دوسرا کیوں نازل ہوابلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو نازل ہوا، کتنا مناسبِ حال تھا۔ اب ایسے حال میں کہ بعد والا حکم پہلے والے کی مانند یااُس سے زیادہ مناسب حال ہو،اعتراض کرنے کی کیاقدر وقیمت رہ جائے گی۔
- دنیا میں تو حکمرانوں کے احکامات اِس لئے بدلتے رہتے ہیں کہ اپنے ضعف وناتوانی کی حالت میں ایک حکم جاری کر دیتے ہیں اور قوت اور غلبے کے حالت میں دوسرا۔ ایک وقت کے لئے مناسب احکام دوسری حالت کی موجودگی میں نافذ نہیں کئے جاسکتے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اِس سے یک سر مختلف ہے اُس کے احکام تمہارے ضعف کو مدِ نظر رکھ کر تبدیل کئے جاتے ہیں نہ کہ اُس کی عدم قدرت کی وجہ سے۔
- یہ احکامات اُس ہستی کی طرف سے ہیں جو زمین و آسمانوں کا مطلق العنان حکمران اور تم سب کا ولی و ناصر ہے۔ اب ایسی ذات کے نہ تو اوامر پر اعتراض ہو سکتاہے اور نہ انسان کو یہ ہی زیباہے کہ اپنے ولی اور نصیر خدا کی رہنمائیوں کے بارے میں یہ گمان رکھے کہ مبادا پہلی یادوسری والی ہدایات میں اُس کی خیر اور مصلحت کا پورا پوراالتزام نہیں رکھا گیاہو گا۔
- مشرک اور اہلِ کتاب تو حسد اور کینے کے مارے ایسے سوالات کرتے ہیں اُن کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ بات سمجھ جائیں تو ایمان لے آئیں۔ اعتراضات اِس لئے کرتے ہیں کہ تمہارے اوپر اللہ کی نوازشات برداشت نہیں کر پا رہے ہوتے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْـَٔلُواْ رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ ٱلْكُفْرَ بِٱلْإِيمَـٰنِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

(١٠٨)۔ کیا تم بھی اپنے پیغمبر سے ویسے ہی سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے اِس سے قبل موسیٰ علیہ السلام سے کئے گئے تھے۔ اور جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل ڈالے تو بے شک وہ راہِ راست گم کر بیٹھا۔

---

(١٠٨)۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنے پیغمبر سے ویسے ہی سوالات پوچھنے شروع کر دو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے اُن کے پیروکاروں نے پوچھے تھے مگر جواب ملنے کے بعد بھی مسلمان نہ ہوئے۔ اِسی سورت کی آیت ٦٧ سے آیت ٧١ تک آپ نے بنی اسرائیل کے موسیٰؑ سے پوچھے گئے سوالات دیکھ لئے۔ اِن سوالات کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ کا حکم ماننے پر تیار نہیں تھے صرف تاخیری حربے استعمال کر رہے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے استفسارات بھی بنی اسرائیل کی طرح شکوک کی پیداوار ہوں، اُنہوں نے تو اپنے ایمان کو کفر سے بدل ڈالا تھا اور یہی اُن کے سوالات کا اصل عامل تھا۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَـٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَـٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلْحَقُّ ۖ فَٱعْفُواْ وَٱصْفَحُواْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُواْ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾

(١٠٩)۔ اہلِ کتاب میں سے اکثریت کی یہ خواہش ہے کہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر سے کفر کی طرف پھرالیں، بوجہ اپنی بعد از انکشافِ حقیقت حسد کے، تو اِن سے گذر جاؤ (درگذر کر لو) اور چشم پوشی کر لو تاوقتیکہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (١١٠)۔ اور نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور اچھائیوں میں سے جو کچھ بھی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، یقیناً اللہ تمہاری کوششوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

(۱۰۹۔۱۱۰) اہلِ کتاب کے وہ مذہبی پیشوا جو تم کو ایسے سوالات پوچھنے پر اُکساتے ہیں، دراصل تمہیں دوبارہ کفر کی راہ پر چلانے کے خواہشمند ہیں اس حال میں کہ وہ حقیقت کو اچھی طرح جان چکے ہیں۔ یہ تمام سوالات اُن کے حسد اور کینے کا حاصل ہیں، اِن کو اہمیت نہ دو، بے مقصد بحثوں میں نہ اُلجھو، اللہ کے فیصلوں کا انتظار کرو، قدیر اللہ خود ہی اِن کا علاج کر دے گا۔ اپنا وقت اِن کے ساتھ بحث مباحثوں میں فضول ضائع کرنے کی بجائے اپنے اصل کام کی طرف توجہ رکھو، نماز، زکوٰۃ اور فلاح کے دوسرے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔ بے فکر رہو تمہارا معاملہ اُس بصیر اللہ کے ساتھ ہے جو تمہارے ہر کام کا ناظر اور شاہد ہے۔

وَقَالُواْ لَن يَدْخُلَ ٱلْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَٰرَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُواْ بُرْهَٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُۥ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُۥٓ أَجْرُهُۥ عِندَ رَبِّهِۦ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

(۱۱۱)۔ اور اِن کا کہنا ہے: کبھی کوئی جنت میں داخل نہیں ہو گا بجز یہودیوں اور نصرانیوں کے!! یہ تو (صرف) اِن کی خواہشات ہیں۔ (اِنہیں) کہو: اگر سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو، (۱۱۲)۔ نہیں؛ بلکہ امرِ واقع یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہو وہ عملاً صالح، تو اُس کے لئے اپنے رب کے ہاں اَجر (محفوظ) ہے اور اُس کے لئے نہ خوف (کا اندیشہ) ہے اور نہ حُزن۔

(۱۱۱۔۱۱۲)۔ ملاحظہ کریں یہاں پہنچ کر مذہب کو قوم سے بدل دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ جو کوئی یہودی ماں باپ سے پیدا ہوا، وہ یہودی ہے۔ لہٰذا جنت کا تنہا اور حقیقی وارث، یہودی کے علاوہ کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بالکل ایسا ہی نقشہ آج ہمارے ہاں نظر آنے لگا ہے۔ سُنی ماں باپ کا بیٹا سُنی ہے، سلفی سے تولّد ہونے والا سلفی اور شیعہ کی اولاد شیعہ؛ جنت کا تنہا حقدار اور دوزخ کی آگ سے آئمہ کے طفیل ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون۔ مگر اللہ تعالیٰ اِس کے جواب میں فرماتا ہے کہ: اِس مزعومہ دعوے کے ثبوت کے لئے اپنی دلیل تو پیش کرو! اللہ کی کونسی کتاب میں آیا ہوا ہے کہ صرف تم ہی جنت میں جاؤ گے؟ کتابوں میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ: جو کوئی اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گا اور وہ نیکوکار ہو گا تو اُس کا اَجر اُس کے رب کے ہاں (محفوظ) ہے۔ نہ اُس کے لئے خوف کا کوئی اندیشہ ہے اور نہ اُس کا حزن سے کوئی سابقہ پیش آئے گا۔ اللہ کے دین میں تو ایمان اور عملِ صالح ہی معیار اور کسوٹی ہیں نہ کسی کی نسل اور قوم پوچھی جائی گی اور نہ نام و نسب۔

وَقَالَتِ ٱلۡيَهُودُ لَيۡسَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ عَلَىٰ شَيۡءٖ وَقَالَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ لَيۡسَتِ ٱلۡيَهُودُ عَلَىٰ شَيۡءٖ وَهُمۡ يَتۡلُونَ ٱلۡكِتَٰبَۗ كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡۚ فَٱللَّهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُواْ فِيهِ يَخۡتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ أَن يُذۡكَرَ فِيهَا ٱسۡمُهُۥ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَآۚ أُوْلَٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمۡ أَن يَدۡخُلُوهَآ إِلَّا خَآئِفِينَۚ لَهُمۡ فِي ٱلدُّنۡيَا خِزۡيٞ وَلَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٞ ﴿١١٤﴾

(۱۱۳)۔ اور یہود نے کہا: نصرانی کسی شے (راہِ راست، دینِ حق) پر نہیں اور نصرانیوں نے کہا: یہود کسی شے (راہِ راست، دینِ حق) پر نہیں حالانکہ (یہ دونوں) کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کے دعوے اُن لوگوں نے بھی کئے جو (کتاب کا) علم نہیں رکھتے۔ تو اللہ اِن کے مابین قیامت کے دن اُن چیزوں کا فیصلہ فرمادے گا جن میں یہ اختلافات کا شکار تھے۔ (۱۱۴) اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے مسجدوں میں اللہ کے ذکر کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے گا یا اُن کی ویرانی کی کوشش کرے گا۔ ایسے لوگوں کا تو ایسے مقامات میں داخلہ ہی نامناسب ہے اور اگر (کبھی داخل) ہوں بھی تو ڈر ڈر کر ہوں، دنیا میں اِن کے لئے رسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم۔

---

(۱۱۳)۔ مسلمانوں کے ساتھ اِن کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی ہمیشہ اختلافات کا شکار رہے ہیں۔ اتنے شدید اور ناقابلِ اصلاح اختلافات کہ یہود کہا کرتے تھے: نصرانیت تو حقیقت میں کوئی قابلِ ذکر مذہب ہے ہی نہیں اور نصاریٰ یہی بات یہود کے لئے کہا کرتے تھے حالانکہ دونوں الٰہی کتاب پر ایمان کے دعویدار تھے۔ کتابُ اللہ تو ایک ہی ہے، تورات اور انجیل، ایک دوسرے کے مؤید، اور اللہ کی یہ کتابیں تو اختلافات کے حل کے لئے نازل ہوئی ہیں اِنہوں نے اُنہیں اختلاف کا ذریعہ کس طرح بنا لیا؟ ناسمجھ مشرکین بھی اِن دونوں کے بارے میں یہی کہتے تھے کہ اِن کا مذہب تو درحقیقت کوئی مذہب ہے ہی نہیں۔ تو اِن کے اختلافات کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو، وہ قیامت کے دن اِن کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ جو قوم بھی کتابُ اللہ کو پسِ پُشت ڈال دیتی ہے، وہ گروہوں میں بٹ کر اِسی تقدیر سے دوچار ہو جاتی ہے، انسانوں کے درمیان وحدت اور یگانگت کی ضمانت تو صرف اور صرف اللہ کی کتاب بن سکتی ہے۔

(۱۱۴)۔ یہ تو وہی ہیں جو ہمیشہ اللہ کے بندوں کی راہ کی رکاوٹ بنے ہیں۔ عبادت خانوں میں اُن کے داخلے میں مانع ہوتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے معابد ڈھاتے رہے ہیں بلکہ معنوی لحاظ سے تو خود اپنی عبادت گاہوں کو بھی ویران ہی کرتے رہے ہیں۔

یہ کس طرح دین اور مذہب کی بات زبان پر لانے کی جرأت کرتے ہیں؟ کس الٰہی مذہب کی بنیاد پر اِن کو اِس ظلم کا اجازت نامہ ملا تھا؟ یہ معبدوں اور عبادت گاہوں کے مجاور اور متولی بننے کے اہل نہیں ہیں۔ چاہیئے تو یہ ہے کہ اِن معبدوں کا انتظام ایسے صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو کہ یہ مشرک اُن کے خوف سے ایسی جگہوں کے قریب پھٹکنے اور اُن میں داخل ہونے کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔

وَلِلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُۚ فَأَيۡنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجۡهُ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ وَٰسِعٌ عَلِيمٞ ﴿١١٥﴾

(١١٥)۔ اور یہ مشرق اور مغرب (دونوں) تو اللہ کے ہیں، تو تم جس طرف بھی رُخ پھیرو گے، اللہ وہیں ہے۔ یقیناً اللہ خوب جاننے والا اور وسعت والا ہے۔

(١١٥)۔ اہلِ کتاب؛ ایسے حالات میں کہ اللہ کو بھول گئے تھے، شرک میں پڑے ہوئے تھے، اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا، زندگی کے ہر شعبے میں جہل، فساد، ظلم اور زیادتی برپا کئے ہوئے تھے، چند ظاہری رسوم کے علاوہ دین کے تمام شعار بھول چکے تھے مگر اِس بات پر شدید ردعمل کا اظہار کرنے پر تُل گئے تھے کہ پیغمبر علیہ السلام نے قبلہ کیوں تبدیل کر دیا۔ اِن کے جواب میں کہا گیا ہے کہ: اصل مقصد اللہ کے حضور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ سمتیں تو ساری اللہ کی ہیں، جس طرف بھی منہ پھیر لو اللہ وہاں موجود ہے۔ وہ نہ تو محدود ہے اور نہ محتاجِ مکان۔ قبلے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ اُسی خاص سمت میں کسی مخصوص جگہ تک محدود ہے بلکہ کسی اُمت کے لئے قبلہ مقرر کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُس اُمت کی سمت اور جہت (direction) متعین کی جائے اور یہ اُن کے وحدت کا ذریعہ اور واحد اللہ کی طرف رُخ کرنے کی نشانی بن جائے۔ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی دعوت کا علاقہ حجاز تھا، لہٰذا اُن کے لئے کعبہ قبلہ قرار دیا گیا۔ اِسی طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی دعوت جن علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اُن کے لئے بیت المقدس زیادہ مناسب قبلہ تھا۔

وَقَالُواْ ٱتَّخَذَ ٱللَّهُ وَلَدٗاۗ سُبۡحَٰنَهُۥۖ بَل لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ كُلّٞ لَّهُۥ قَٰنِتُونَ ﴿١١٦﴾ بَدِيعُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ وَإِذَا قَضَىٰٓ أَمۡرٗا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿١١٧﴾

(۱۱۶)۔ اور (اُنہوں نے) کہا: کہ اللہ نے اپنے لئے بیٹا بنایا ہے! پاکی ہے اللہ کے لئے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ تمام چیزیں اُس کی تابع فرمان ہیں۔ (۱۱۷) وہی زمین اور آسمانوں کی پیدائش کی ابتداء کرنے والا، وہ جب بھی کسی کام کے کر ڈالنے کا فیصلہ کرتا ہے تو فقط حکم دے دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

(۱۱۶۔۱۱۷) مشرکین اور گمراہ اہلِ کتاب کے مذہبی پیشوا لوگوں کو کہتے تھے: اللہ کے اپنے مخصوص مقرب بندے ہوتے ہیں، اُن کو خصوصی اختیارات تفویض کئے گئے ہوتے ہیں اور عام لوگوں کی دعائیں اُنہی مقرب بندوں کی وساطت سے قبول ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ اللہ تک اُس کی رسائی ہو، اُس کی حاجتیں پوری ہو جائیں اور دعائیں قبول ہوں تو اُسے چاہیئے کہ اِن مقربین کا دامن تھام لے! یہود کہا کرتے تھے: عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ نصاریٰ کہتے تھے: عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے۔ اِن باتوں سے اِن دھوکے باز مذہبی لیڈروں کا ہدف موسیٰ علیہ السلام کے لئے لوگوں کے دلوں میں مقام پیدا کرنا نہیں بلکہ اپنے لئے عوام کے دلوں میں احترام کا مقام پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اُن کا مقصد اپنے آپ کو اِن انبیاء کا وارث ثابت کرنا ہوتا تھا اور اِس کے ذریعے لوگوں میں یہ اعتقاد پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اب اِن پیغمبروں کا وہ مقام اِن کو منتقل ہو گیا ہے۔ اگر کوئی اپنی دعائیں قبول کرانا اور حاجتیں پوری کرانا چاہتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ اِن سے رجوع کرے۔ اِن کا دامن تھام لے اور شکرانے اور نذریں گزران کر اِن کی رضا حاصل کر لے۔ اللہ کی رضا اِن کی رضا میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے: ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں:

وَ قَالَتِ الْيَهُود وَ النَّصرىَ نحْنُ أَبْنَؤُا الله وَ أَحِبَّؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبكُم بِذُنُوبِكُم بَلْ أَنْتُم بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ: یہود اور نصاریٰ کہا کرتے تھے: ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، اِن کو کہو: تو پھر کیوں تمہیں تمہارے گناہوں پر عذاب دیا جاتا ہے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ تم وہی عام انسان ہو جنہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔

ہر مُحرف مذہب کے گمراہ اور دھوکے باز پیشوا ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ پیغمبر کو اللہ کی اولاد اور جانشین اور اپنے آپ کو اُن کا جانشین قرار دے دیتے ہیں۔ اِس طرح وہ مذہب کو اپنے لئے دکان اور عوام کے بہکانے کے لئے دام بنا لیتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ اِن کے جواب میں فرماتا ہے: کہ زمین اور آسمانوں میں موجود ہر چیز جس کے قابو میں ہو، ہر چیز جس کے تابع ہو، جو زمین اور آسمانوں کا خالق ہو اور جس کام کا ارادہ کر لے وہ صرف اُس کے ایک امر سے انجام پذیر ہو جاتا ہو، وہ کیوں کسی کو اپنا شریک، جانشین اور بیٹا مقرر کرے گا؟ کس لئے اپنی مملکت کے بعض کام کسی دوسرے کے سپرد کرے گا؟ یہ کام تو اُس کسی کے کرنے کے ہیں جو سارے کام خود اکیلے اور کسی دوسرے کی مدد کے بغیر انجام دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ اِس دقیق اور گہرے جواب سے نہ صرف اِن دھوکے باز مذہبی لیڈروں کے موقف کو رد کیا گیا ہے بلکہ ہر اُس یقین اور عقیدے کی بیخ کنی کی گئی

ہے جس کا دعویٰ ہے کہ: اللہ کے ایسے خاص محبوب بندے ہوتے ہیں جن کو مخصوص اختیارات تفویض کئے گئے ہوتے ہیں اور اللہ عام بندوں کی عبادات اور دعائیں اُن مقربین کی وساطت، وسیلے اور ذریعے سے قبول کرتا ہے۔

وَقَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا ٱللَّهُ أَوۡ تَأۡتِينَآ ءَايَةٞۗ كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِم مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡۘ تَشَٰبَهَتۡ قُلُوبُهُمۡۗ قَدۡ بَيَّنَّا ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾ إِنَّآ أَرۡسَلۡنَٰكَ بِٱلۡحَقِّ بَشِيرٗا وَنَذِيرٗاۖ وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلۡجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرۡضَىٰ عَنكَ ٱلۡيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡۗ قُلۡ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلۡهُدَىٰۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم بَعۡدَ ٱلَّذِي جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِيّٖ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾

(۱۱۸)۔اور وہ بے علم اور ناسمجھ بھی کہتے تھے: اللہ ہمارے ساتھ (آمنے سامنے) بات کیوں نہیں کرتا اور کوئی واضح نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح اِن کے پیشرووں نے بھی اِسی قسم کی بات کہی، اِن کے دل آپس میں ملے ہوئے ہیں، بے شک یہ آیات ہم نے یقین کرنے والوں کے لئے بیان کی ہیں۔ (۱۱۹) اور بے شک تمہیں ہم نے برحق بشارت دینے اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور جہنمیوں کے بارے میں تم سے باز پُرس نہیں ہونی۔ (۱۲۰) اور نہ کبھی یہود تم سے راضی ہوں گے اور نہ ہی نصاریٰ، جب تک تم اُن کے دین کی پیروی نہیں کرنے لگو گے، (انہیں) کہو: اللہ کی رہنمائی ہی حقیقی رہنمائی ہے، اور اگر تم نے اِن کے ہویٰ اور ہوس کی متابعت کی، بعد اُس علم کے جو تمہارے پاس آچکا ہے؛ تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہیں پاؤ گے۔

(۱۱۸)۔ مشرکین پیغمبر علیہ السلام سے کہا کرتے تھے کہ: تمہارا خدا ہم سے براہِ راست بات کیوں نہیں کرتا؟ کیوں ایسی نشانیاں نہیں بھیجتا جن کے بعد کسی کے لئے شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے؟ یہ صرف اِن کی بات نہیں اِن سے قبل بھی بہت سے ناسمجھ ایسی بات کرتے رہے ہیں اور اِن کے بعد بھی ایسی بات کرنے والوں کی کمی نہیں ہوگی۔ اِن کے دل آپس میں ملتے جُلتے ہیں، اِن کے سینوں میں ایک جیسے افکار اور خیالات موجزن ہیں۔ اِن کو نہ تو اِس عالم میں پھیلی ہوئی یہ بے شمار نشانیاں کفایت کرتی ہیں اور نہ ہی تمہارے قوی اور قانع کرنے والے دلائل۔ جن لوگوں میں حقائق کو ماننے اور اعتراف کرنے کا مادہ موجود

ہوتا ہے اُن کی تسلی و تشفی کے لئے یہ دلائل بہت ہی کافی ہیں مگر جن کے اندر یہ مادہ مضمحل ہو گیا ہوتا ہے اُن کو کوئی دلیل قائل نہیں کر سکتی۔

(۱۱۹۔۱۲۰)۔ اِن مبارک آیات میں پیغمبر علیہ السلام اور اُن کی وساطت سے ہر داعی کی بہت اہم رہنمائیاں کی گئی ہیں۔ آپؐ کو کہا گیا ہے کہ:

- تمہیں ہم نے برحق بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، اِن کی مخالفت کی پروانہ کرو، اِن کے ایمان نہ لانے کی باز پُرس تم سے نہیں ہونی۔
- کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہر قسم کے دلائل اور نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی کسی صورت ایمان نہیں لاتے اور کفر و فساد سے باز نہیں آتے۔
- اِن کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپؐ نہ تو مایوس ہوں اور نہ ہی اپنی دعوت کی حقانیت کے بارے میں کسی شک کو دل میں جگہ دیں اور نہ ہی اِس بے قراری میں مبتلا ہوں کہ کاش اِن کو قائل کرنے کے لئے اِن کی خواہش کے مطابق دلائل ہمارے پاس موجود ہوتے۔ اللہ کی طرف سے پیش کردہ دلائل کافی ہیں اور صرف اِنہی کو حقیقی ہدایت سمجھو۔ اپنا قیمتی وقت اِن کے ساتھ بے فائدہ بحثوں میں ضائع نہ کرو۔ اِن میں ہدایت قبول کرنے کا مادہ ختم ہو چکا ہے اور اِن کے دل کالے پتھروں کی مانند ہو چکے ہیں۔ اِن کے اوپر کسی کا بھی دعوتِ حق اثر انداز نہیں ہو سکتا۔
- اِن کے بجائے اُن لوگوں پر توجہ دو جن میں حق کو ماننے اور حق پرستوں کا ساتھ دینے کا مادہ نظر آتا ہو۔
- ا ِن کو راضی کرنے اور اِن کی دشمنی کم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ جب تک آپ حق کہنا ترک نہیں کریں گے، اپنا دین اور اپنا راستہ چھوڑ نہیں دیں گے اور اِن کا دین اور مذہب اختیار نہیں کریں گے یہ کسی صورت راضی نہیں ہوں گے۔
- اگر اِن حقائق کو جاننے کے بعد بھی تم نے اِن کو راضی کرنے کی کوشش جاری رکھی، اِن کی شرائط کے آگے سر جھکا دیا اور اِن کی ہویٰ و ہوس کا راستہ اختیار کیا تو جان لو کہ اللہ کے ساتھ اپنا ہر تعلُق توڑ بیٹھو گے۔ نہ تو وہ آپ کا مولا اور مدد گار رہے گا اور نہ ہی تم کوئی دوسرا مولا اور مدد گار ڈھونڈ سکتے ہو۔

ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَـٰهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ يَتْلُونَهُۥ حَقَّ تِلَاوَتِهِۦٓ أُو۟لَـٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِۦ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِهِۦ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ ﴿١٢١﴾

---

(۱۲۱)۔ وہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اِس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اِس (کے تلاوت) کا حق ہے، وہ اِس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اِس کا انکار کرتے ہیں پس وہی خاسر و نامراد ہیں۔

---

(۱۲۱)۔ جو لوگ کتاب کا حق ادا کرتے ہوئے اِسے اِس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اِس کتاب کے ساتھ زیبا ہے تو وہ لازماً اِس پر ایمان سے بہرہ مند ہو جائیں گے اور جو اِس کتاب پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہو پاتے سمجھو کہ اُن کی دنیا اور آخرت برباد ہے۔ کوئی شے اُن کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

يَـٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَٱتَّقُوا۟ يَوْمًا لَّا تَجْزِى نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَـٰعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾

(۱۲۲)۔ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تم کو نوازا اور تمام دنیا والوں پر تمہیں فضیلت عطا کی۔
(۱۲۳) اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کی ذمہ داری اُٹھا سکے گا، نہ کسی کا کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ ہی کسی کی کوئی مدد کی جا سکے گی۔

(۱۲۲۔ ۱۲۳)۔ یہ مبارک آیات پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ اِن کی تکرار سے پتہ چلتا ہے کہ اِن میں بنی اسرائیل کے عملی اور اعتقادی انحرافات کے اساسی عوامل کی طرف اشارہ موجود ہے اور یہ اُن کے شرک اور فساد کی جڑیں طشت از بام کرتی ہیں۔

۞ وَإِذِ ٱبْتَلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَـٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِى ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴿١٢٤﴾

(۱۲۴)۔ اور جب ابراہیم علیہ السلام کو اُس کے رب نے کچھ اُمور میں آزمایا، جن کے انجام دینے میں وہ سرخرو ہوا، تو فرمایا: میں تمہیں لوگوں کے لئے امام اور پیشوا بنانے والا ہوں تو وہ بولا: اور میری اولاد میں سے بھی؛ فرمایا: میرا وعدہ ظالموں کو محیط نہیں ہے۔

(۱۲۴)۔ ابراہیم علیہ السلام متعدد آزمائشوں سے گزارے گئے تھے۔ اُن میں اپنے والد اور قوم کی مخالفت، قید میں ڈالا جانا، آگ میں ڈالا جانا، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی زندگی اختیار کرنا، مکہ کے وحشتناک ویرانے میں اسمٰعیلؑ اور ہاجرہؓ کو تنہا چھوڑ دینا اور اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے پر تیار ہو جانا وغیرہ جیسی آزمائشیں شامل تھیں۔ جب وہ ان تمام آزمائشوں پر پورے اُترے تو اِس عظیم امتحان میں کامیابی کی جزا اللہ نے یہ مقرر فرمائی کہ لوگوں کی امامت اور پیشوائی کے مقام سے نواز دیئے جائیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ اب تم لوگوں کی پیشوائی کے اہل ہو، میں یہ مقام تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اُنہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کاش یہ مقام اُس کی اولاد کے حصے میں بھی آجائے۔ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اِس فرمان میں ظالم شامل نہیں ہیں؛ وہ چاہے پیغمبر ہی کی اولاد میں سے کیوں نہ ہوں اِس مقام کی اہلیت نہیں رکھتے۔

انتہائی تعجب خیز امر ہے کہ یہاں بھی بعض لوگ ابتلا ٔت سے قرآن میں مذکور ان آزمائشوں کے بجائے ناخن کاٹنے اور اضافی بال تراشنے جیسے غیر اہم کام مراد لیتے ہیں۔

بنی اسرائیل اِس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اُن کے علاوہ بھی متعدد انبیاء اُن میں مبعوث ہوتے رہے ہیں، لہٰذا وہ اِن انبیاء کے وارث ہیں۔ لوگوں کی پیشوائی اور امامت اُن کا حق ہے اور وہ جنت کے لئے اور جنت اُن کے لئے پیدا کی گئی ہے وعلیٰ ہٰذالقیاس۔ یہاں پر اُن کے اِن غلط اور بے بنیاد تصورات کی نفی کے لئے کہا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ امامت اُن کی اولاد کو دینے کے اللہ تعالیٰ کے اُس وعدے میں ظالم اولاد شامل نہیں تھی۔ تم نے ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے روگردانی کی ہے پس تمہارے ظلم اور شرک نے تمہیں اُس کی وراثت اور اُمت سے نکال باہر کیا ہے۔ اللہ کے ہاں کسی کی رشتہ داریاں، اور قومی ونسلی تعلقات اور وابستگیاں ذرہ برابر وقعت نہیں رکھتیں۔ اللہ کے ہاں لوگوں کے بارے میں فیصلے اِس بنیاد پر بالکل بھی نہیں ہوتے، اُس نے توسب کو ایک ہی مادے اور ایک ہی جوڑے سے پیدا فرمایا ہے۔ اپنے بندوں سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ اُن کے ایمان اور اعمال کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ اُن کے جاہ ونسب کی بنیاد پر۔

وَإِذْ جَعَلْنَا ٱلْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَٱتَّخِذُوا۟ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَـٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَـٰذَا بَلَدًا ءَامِنًا وَٱرْزُقْ أَهْلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ مَنْ ءَامَنَ مِنْهُم بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُۥٓ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلنَّارِ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾

(۱۲۵)۔ اور جب ہم نے اِس گھر (خانہ کعبہ) کو لوگوں کے جمع ہونے کا مقام اور امن کا ذریعہ قرار دیا اور (کہا): ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کے لئے مخصوص کر دیں اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم بھیج دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔(۱۲۶) اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! اِسے ایک محفوظ شہر بنا اور اِس کے اُن رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں۔ (اللہ نے) فرمایا اور جو کافر ہو رہیں تھوڑا (متاع دنیا) اُن کو بھی عطا کروں گا، پھر اُن کو آگ کے عذاب کی طرف ہانک دوں گا اور کتنا بدترین ہے یہ لوٹایا جانا۔

(۱۲۵۔۱۲۶)۔ اِن آیاتِ مبارکہ میں کچھ اہم باتیں خصوصی توجہ کے قابل ہیں:

- مشرکین کو کہا گیا ہے کہ: یہ کس طرح تم اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو حالانکہ اُن کی ماموریت تو یہ تھی کہ کعبے کی تعمیر کے ذریعے اِس سارے علاقے کو شرک، کفر، فساد اور ظلم سے پاک کر دیں جبکہ تم نے وہی کعبہ بتوں سے آباد کر کے رکھ دیا۔ تم نے اُن کی دعا اور تمنا کے برعکس اُسی کعبے کے اطراف میں بدامنی کے الاؤ جلا رکھے ہیں اور اللہ کے گھر کی طرف طواف کے لئے آنے والوں کی راہ میں مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔
- اِس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ دعائیں قبول نہیں کرتا جو اُس کے اپنی جاری کردہ سنن وضوابط کے خلاف ہوں چاہے وہ ابراہیم علیہ السلام جیسی عظیم شخصیت کی طرف سے ہی کیوں نہ مانگی گئی ہوں۔ اُس نے نہ تو ابراہیمؑ کی وہ دعا قبول کی جو اُنہوں نے اپنی اولاد کے لئے مانگی تھی اور نہ ہی یہ دعا کہ صرف مومنوں ہی کو رزق دیا جائے۔ اِس لئے کہ روزی کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ بغیر کسی محاسبے کے، مومن اور کافر دونوں کو دی جاتی ہے۔ اِسی طرح امامت کے بارے میں سنت الٰہی یہ ہے کہ ظالموں کو نہیں دی جاتی بلکہ اُن لوگوں کے حوالے کی جاتی ہے جو آزمائشوں میں پورے اُتر آتے ہیں۔ اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر زعامت اور ہر سرداری و اختیار امامت کی تعریف میں شامل نہیں ہے۔ ظالم حکمران اور زبردستی مسلط کئے گئے مختارِ کار دراصل گمراہ قوموں کے اعمال کی سزا کے طور پر مسلط کئے جاتے ہیں۔ اِن دو صورتوں میں فرق کرنا بعض لوگوں کے لئے دشوار ہوتا ہے اور وہ ہر برسرِ اقتدار مقتدر کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ گویا اللہ نے اُس پر بڑا فضل و کرم فرمایا ہے، اور یہ کہ وہ اِس عظیم الٰہی نوازش کا اہل ہے۔ حالانکہ ایک امامت ابراہیم علیہ السلام کی امامت ہے اور دوسری فرعون کی۔ ایک لوگوں کی رہنمائی کے لئے اور اُن کے صالح اعمال کے انعام کے طور پر اور دوسری لوگوں کے گناہوں کا حاصل اور اُن کی تعذیب کا ذریعہ۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَٰهِـۧمُ ٱلْقَوَاعِدَ مِنَ ٱلْبَيْتِ وَإِسْمَـٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَٱجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَٱبْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

(۱۲۷)۔ اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہم السلام) اِس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (کہہ رہے تھے): اے ہمارے رب! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرما۔ بے شک تو خوب جاننے والا سننے والا ہے۔(۱۲۸)۔ اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک مسلم اُمت اور ہم کو ہمارے دینی مناسک سکھا دے اور ہماری توبہ قبول فرما۔ یقیناً تو بڑا مہربان توبہ قبول کرنے والا ہے۔(۱۲۹)۔ اے ہمارے رب! اِن کے اندر خود اِنہی میں سے ایسا پیغمبر مبعوث فرما جو اِنہیں تمہاری آیات پڑھ کر سُنائے، کتاب اور حکمت سکھائے اور اِن (کی زندگی) کو سنوار دے۔ بے شک تو ہی باحکمت مقتدر ہے۔

(۱۲۷)۔ یہی اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ زمین پر توحید کی بنیاد رکھ دی جائے اور یہاں پر کعبہ اور موحدین کے اکٹھا ہونے کا مرکز بنا دیا جائے۔ اللہ کی مرضی ہوئی کہ اِس مرکز کی بنیاد ایک بے مثل موّحد اور عظیم بُت شکن کے مبارک ہاتھوں سے رکھ دے، یوں ابراہیمؑ اور اُس کے فداکار بیٹے اسمٰعیلؑ کو اللہ نے اِس کام کے لئے چن لیا۔ ابراہیم علیہ السلام عراق میں ایک بت پرست کے گھر میں پیدا ہوئے تھے جو خود ہی ایک ماہر بت تراش بھی تھا۔ یہ نمرود کی سلطنت تھی؛ ایک شرک آلود جاہلی معاشرہ، جہاں لوگ زندہ نمرود کے آگے تو جھکتے ہی تھے اُس کے مجسمے کے آگے بھی مراسمِ عبودیت ادا کرتے تھے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام اپنے دل کو نہ توبے جان بت کی پرستش پر آمادہ کرسکے اور نہ ہی زندہ نمرود کی اطاعت پر۔ اپنے والد اور قوم سے کہا: میں تمہارے ہاتھوں اور تصورات کے تخلیق کردہ جعلی معبود نہیں مانتا؛ نہ یہ بت، نہ یہ سورج، چاند اور ستارے اور نہ ہی کسی اور فانی ذات کو خدا تسلیم کرتا ہوں۔ اللہ تو وہ ہے جس نے تمام موجودات پیدا کیں اور جو تمام چیزوں کا خالق ہے مگر جب آپؑ نے محسوس کیا کہ اِن لوگوں کے سامنے محض دعوت اور دلیل سے شرک کا ابطال نہیں کیا جا سکتا تو دل میں عہد کیا کہ وہ اِن بتوں کو اوندھے منہ گرا ڈالے گا۔ وہ جانتا تھا کہ نمرود کے ظالمانہ نظام کی بنیادیں اِنہی بتوں کے احترام پر قائم ہیں اور عوام کی مظلومیت، جہل اور ذلت وخواری میں زندگی گزارنے کے ذمہ دار بھی یہی بت اور اِن کی پرستش کا نظام ہے۔ غرض آپؑ نے نہ عوام کے ممکنہ جذبۂ انتقام کا کوئی لحاظ رکھا

اور نہ ہی نمرود کے غیض و غضب کی پرواکی۔ اگرچہ اکیلا تھا اور ایک کلہاڑی سے بڑھ کر کوئی ہتھیار بھی فراہم نہیں کر سکتا تھا مگر اِس قسم کے اندیشے اُس کے عزم و ہمت اور ارادوں کو متزلزل نہ کر سکے۔ کلہاڑی لے کر بت کدہ میں گھسا، تمام بتوں کو توڑ کر کلہاڑی بڑے بت کے گلے میں لٹکا دی اور آرام و سکون سے بت کدے سے نکل آیا۔ یہ میلے کا دن تھا لوگ میلے میں نمرود کی عبادت کر کے لوٹ آئے تو گھر جانے سے قبل بت کدے میں جھانکا کہ گھڑی بھر کیلئے اب نمرود کے مجسموں کی بھی عبادت ہو جائے تو زیادہ بڑے اطاعت شعاروں میں نام آئے۔ مگر یہ کیا! یہاں کے تو حالات ہی بدلے ہوئے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ تمام بت ٹوٹے پھوٹے اوندھے منہ پڑے ہوئے ہیں۔ بڑے والے کی اُن سے بھی زیادہ گت بنی ہوئی ہے؛ گلے میں کلہاڑی ڈالے دوسروں کے توڑنے کی تہمت کا سہرا اُٹھایا بھی نہیں جاتا اور کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ یہ وہی معبود تھے جن سے لوگ اپنی حاجت روائی اور معاملات کی درستگی کے لئے رجوع کرتے تھے اِس لئے کہ اُنہیں یہی باور کرایا گیا تھا اور سمجھایا گیا تھا کہ تمہاری مشکلات کا منبع اور سرچشمہ اربابِ اختیار، اُن کے تصرفات اور حکمران نظام نہیں بلکہ اِن خداؤں کی ناراضگی ہے۔ سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ہر نمرودی نظام کو اِسی ہی چیز اور حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اَب ملزم کی ڈھونڈیا پڑ گئی، ابراہیمؑ کے علاوہ اور کون تھا جس پر اِس حرکت کا الزام لگ سکتا تھا لہٰذا اُسے حاضر کیا گیا اور پوچھا گیا: کیا یہ کام تم نے کیا ہے؟ ابراہیمؑ تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے کہ بت پرست کسی بڑے مجمع میں اُن سے ایسے ہی حالات میں اِس قسم کے سوالات پوچھ بیٹھیں۔ فوراً جواب دیا: کلہاڑی تو اِس بڑے بت کے گلے میں ہے، پوچھ لیں اگر یہ بول سکے، (لگتا ہے اِسی نے کیا ہوگا)۔ بت پرست بولے: اے ابراہیم! تو جانتا ہے یہ بول نہیں سکتے! وہ یہی جواب سننا چاہتا تھا؛ کہنے لگا تو پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ بول سکتے ہیں نہ اپنے آپ سے کوئی ضرر دفع کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ افسوس ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر!! ایسے میں قوم اور اُس کے سالار نمرود کا فیصلہ تو ظاہر ہے، قید، آگ میں ڈالنا اور وہ سب کچھ جو دوسروں کے لئے عبرت بن سکے، تھا ہی مگر ابراہیمؑ نے اس موقع کو بھی دعوت کے لئے استعمال کیا۔ اپنے لئے نمرود کے منہ سے موت اور آگ میں جلائے جانے کا فیصلہ سن کر فرمایا: زندگی اور موت کا فیصلہ تو اُس ذات کے اختیار میں ہے جو سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب میں غروب کرتا ہے۔ اِسی طرح آگ میں ڈالے جانے کے وقت فرمایا: میرے لئے اللہ ہی کافی ہے، وہی سب سے بڑا وکیل اور کارساز۔ یہ تھا ابراہیم علیہ السلام! جسے اللہ نے کعبے کی تعمیر کے لئے آگ سے بچا لیا، عراق سے شام اور پھر وہاں سے مکہ بلایا اور یہاں لا کر ہاجرہ اور دودھ پیتے اسمٰعیل علیہما السلام کو اِس بے آب و گیاہ اور وحشتناک بیابان میں چھوڑنے کا حکم دیا۔ ابراہیمؑ اِس بڑے امتحان سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئے مگر اسمٰعیلؑ کی نوجوانی کی دہلیز پر پہنچنے کے وقت پھر امتحان کا مرحلہ آیا۔ اب ابراہیمؑ نے ایک ایسا خواب

دیکھا جس میں اسمٰعیلؑ کی قربانی کا اشارہ دیا گیا تھا۔ اُن کے لئے اتنا ہی کافی تھا، جا کر بیٹے سے ذکر کیا تو اُس نے جواب میں کہا: اے میرے باپ! آپ کو جو حکم ملا ہے کر گزریئے، مجھے صابر اور مطیع پائیں گے؛ یوں وہ دونوں اُس بڑے اور خطرناک امتحان سے بھی سرخرو نکل آئے۔ اب کہیں جا کر وہ دونوں اِس عظیم کام کے اہل قرار دیئے جاتے ہیں کہ روئے زمین پر اللہ کا مبارک گھر، کعبہ اور موّحدین کا قبلہ اُن کے ہاتھوں تعمیر کیا جائے۔ اب وہ اِس کی دیواریں اُٹھا رہے ہیں، ذرا چشمِ تصور میں اُس تاحدِ نظر پھیلے ہوئے وحشتناک ویرانے میں اپنے دیس سے نکالے گئے دو مہاجرین کو عملاً اوپر تلے پتھر رکھ کر تعمیر کا کام آگے بڑھاتے ہوئے دیکھیں۔ اُن کی زبان پر زمزمہ جاری ہے: اے ہمارے رب! ہم سے (یہ خدمت) قبول کر لے، بے شک تو خوب جاننے والا سننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنے منقاد اور تابع فرمان بنا دے اور ہماری اولاد میں سے ایک منقاد اُمت کی بنیاد ڈال دے اور ہمیں اپنے دینی مناسک سکھا دے اور ہماری توبہ قبول فرما، یقیناً تو خوب توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ تاریخ کو ذرا تصور کے آنکھ سے دیکھیں؛ اُس ویرانے میں اِس شان اور اِس اہتمام سے تعمیر ہونے والے گھر کا آج چار ہزار سال بعد بھی ہر سال لاکھوں لوگ طواف کرتے ہیں۔ وہی دو ابتدائی معمار رہنما ہیں، اُنہی کا نقشِ پا نشان راہ ہے اور سب وہی کچھ کر رہے ہیں جس کی دعا اُن دونوں نے اپنے رب سے مانگی تھی۔

(۱۲۸۔۱۲۹)۔ اِن مبارک آیات میں بنی اسرائیل کے اور ہر اُس مذہبی گروہ کے غلط تصورات کا ابطال کیا گیا ہے جو مذہب اور مذہبی حیثیت کو موروثی سمجھتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ یہ باپ سے اولاد کو خود بخود میراث میں منتقل ہونے والی چیزیں ہیں۔ یا پھر یہ اُمیدیں رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انبیاء اور اللہ کے دوستوں سے نسبت کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کی نوازشات کے اہل، امامت کے وارث اور جنت کے مستحق قرار پا جائیں گے۔ اِن کو کہا گیا ہے کہ نہ تو مذہب اور عقیدہ کوئی ایسی چیز ہے جو میراث میں منتقل ہو سکتی ہو اور نہ مذہبی مقام ایسا مقام ہے جو باپ سے اولاد کو میراث میں مل سکتا ہے۔ اللہ کے دین میں ہر کسی سے معاملہ اُس کے اپنے عقیدے اور عمل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور ہر کسی سے اُس کے اپنے ذاتی کرتوتوں کا پوچھا جائے گا۔ اپنے آپ کو انبیاء سے منسوب کرنا اور اپنے آپ کو اُن کے مقام و منزلت کا وارث فرض کر لینا اور اِس کی بنیاد پر معاشرے میں امتیازات کا حصول، یہ تمام وہی کام ہیں جو بنی اسرائیل کے دھوکے باز مذہبی پیشوا کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے خاص گھرانے کے افراد، پیغمبروں کے وارث اور جانشین سمجھتے تھے اور اپنی نسبت ابراہیمؑ کی طرف کرتے تھے۔ اُن کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ابراہیمؑ مشرک نہیں تھا۔ اُس نے اپنی اولاد کے لئے تمنا کی تھی کہ لوگوں کے رُشد و ہدایت کے لئے امامت اور قیادت کے مقام پر فائز ہوں، مگر اللہ نے اُن کی دعا کے جواب میں فرمایا تھا کہ: یہ مقام ظالموں کے حصے میں نہیں آسکتا۔ ابراہیم علیہ السلام نے تو کعبہ اِس لئے تعمیر کیا تھا کہ یہ امن کا گھر قرار پائے، امن کا ذریعہ بن جائے، یہاں لوگ سکون و اطمینان کے ساتھ اللہ کے ذکر اور عبادت میں مشغول ہو سکیں۔ اُس

نے تو خواہش اور دعا کی تھی کہ اِس خطے کے رہنے والے اللہ کے شاکر بندے بنیں، اِن میں ہمیشہ ایسے انبیاء مبعوث ہوتے رہیں جو اِنہیں دین کی تعلیم دیں اور گناہوں سے بچا کر رکھیں۔ اُس نے تو اپنی اولاد کو نصیحت کی تھی کہ صرف (واحد) اللہ کی عبادت کریں۔ یہی تھی ابراہیم اور تمہارے جد یعقوب علیہما السلام کی نصیحت؛ پھر تم کس طرح اپنے شرک، فساد، ظلم، اور دین اور دین داروں کے ساتھ دشمنی پر عامل رہتے ہوئے اُن کی طرف اپنی نسبت روا رکھتے ہو۔

وَمَن يَرۡغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبۡرَٰهِـۧمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفۡسَهُۥۚ وَلَقَدِ ٱصۡطَفَيۡنَٰهُ فِي ٱلدُّنۡيَاۖ وَإِنَّهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ ﴿١٣٠﴾ إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿١٣١﴾ وَوَصَّىٰ بِهَآ إِبۡرَٰهِـۧمُ بَنِيهِ وَيَعۡقُوبُ يَٰبَنِيَّ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصۡطَفَىٰ لَكُمُ ٱلدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسۡلِمُونَ ﴿١٣٢﴾

(۱۳۰)۔ بجز اُس شخص کے جو خود ہی حماقت پر تلا ہوا ہو، اور کون ابراہیم علیہ السلام کے دین سے روگردانی کرے گا۔ بے شک ہم نے اُسے دنیا میں چُن لیا تھا اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہوگا۔ (۱۳۱) اُس وقت جب اُس کے رب نے کہا: مسلم ہو جا، تو اُس نے کہا: میں عالموں کے رب کے سامنے (پہلے ہی سے) مطیع اور مسلم ہوں۔ (۱۳۲) اور اِس بات کی وصیت تو ابراہیم نے بھی اپنی اولاد کو کی تھی اور یعقوب (علیہما السلام) نے بھی کہ: اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے یہ دین چن لیا ہے، خبردار تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

(۱۳۰۔۱۳۲)۔ ابراہیم علیہ السلام کی تو بڑی نشانی یہ تھی کہ وہ اللہ کا مطیع اور فرمان بردار تھا۔ خود اُس نے اور اُس کے پوتے یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اسلام اور اللہ کی بندگی سے ہٹنے نہ پائیں، ہمیشہ اللہ کے احکامات کے لئے گوش بر آواز رہیں۔ اب کس منہ سے تم اُن کے ساتھ اپنی نسبت جوڑتے ہو؟

أَمۡ كُنتُمۡ شُهَدَآءَ إِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوبَ ٱلۡمَوۡتُ إِذۡ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعۡبُدُونَ مِنۢ بَعۡدِيۖ قَالُواْ نَعۡبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ ءَابَآئِكَ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ إِلَٰهًا وَٰحِدًا وَنَحۡنُ لَهُۥ مُسۡلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلۡكَ أُمَّةٞ قَدۡ خَلَتۡۖ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُم مَّا كَسَبۡتُمۡۖ وَلَا تُسۡـَٔلُونَ عَمَّا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

(۱۳۳)۔ کیا آپ یعقوب کی جان کنی کے وقت موجود تھے۔ جس وقت وہ اپنے بیٹوں سے کہہ رہے تھے: میرے بعد کس کی عبادت کروگے ؟اُنہوں نے کہا: تمہارے معبود اور تمہارے باپ دادا، ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحاق کے معبود کی، وہی یکتا معبود اور ہم اُس کے حضور سرِ اطاعت خم کئے ہوئے ہیں۔(۱۳۴)۔(بہر حال) ایک گروہ وہ تھا جو گزر گیا، اُن کے لئے اُن کی کمائی ہے اور تمہارے لئے تمہاری کمائی، اُن کے اعمال کی تم سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔

(۱۳۳۔۱۳۴)۔ یعقوب علیہ السلام نے تو اپنے بیٹوں سے یہ عہد لیا تھا کہ صرف ربِ واحد کی عبادت کروگے اور اُسی کے آگے سر جھکاؤ گے۔ تو اِس صورت میں ایک مشرک قوم جو نہ صرف اللہ کے علاوہ بہت سارے دوسرے معبودوں کی عبادت کرتی ہے، اللہ کے مطیع بندوں کو بھی اُس کے ساتھ خدائی میں شریک کئے ہوئے ہے نیز ہر معاملے میں اللہ کے اوامر کی نافرمانی بھی کرتی ہے؛ وہ یہ جسارت کس طرح کر لیتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے ایک عظیم موّحد کی وارث بن بیٹھے۔ گزری ہوئی شخصیتوں سے نسبت کا کیا فائدہ جبکہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اُس کے ذاتی اعمال کی مناسبت سے سزا اور جزا دیتا ہے۔ ہر کسی کو اُس کے اپنے ہاتھ کی کمائی ملتی ہے، کسی دوسرے کے اعمال پر کوئی نہیں پکڑا جاتا۔

وَقَالُواْ كُونُواْ هُودًا أَوۡ نَصَـٰرَىٰ تَهۡتَدُواْ‌ۗ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ إِبۡرَٲهِـۧمَ حَنِيفً۬اۖ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيۡنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلَىٰٓ إِبۡرَٲهِـۧمَ وَإِسۡمَـٰعِيلَ وَإِسۡحَـٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَمَآ أُوتِىَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَآ أُوتِىَ ٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ أَحَدٍ۬ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهُ ۥ مُسۡلِمُونَ ﴿١٣٦﴾

(۱۳۵)۔ اور اِنہوں نے کہا: کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تا کہ صراطِ مستقیم پا جاؤ! اِنہیں کہو کہ: نہیں! ابراہیم کی اُمت (صراطِ مستقیم پر ہے)، وہ حنیف تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ (۱۳۶)۔ تم کہو: ہمارا اللہ پر ایمان ہے اور اُس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد کی طرف نازل کی گئی تھی اور اُس چیز پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی اور وہ جو دوسرے تمام انبیاء کو اللہ کی طرف سے دی گئی۔ ہم اِن میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور اُس (اللہ) کے منقاد اور مطیع ہیں۔

(۱۳۵۔۱۳۶)۔ اُن کا گمان اور موقف یہ تھا کہ یہودی یا نصرانی بن کر انسان صراط مستقیم پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے جواب میں فرماتا ہے: سیدھا راستہ تو ابراہیمؑ کا ہے حق پر قائم اور شرک سے مبراء، وہ تو ہمیشہ حق کا مطیع اور شرک سے بیزار تھا۔ تم تو حق کی مخالفت پر کمر

بستہ ہو اور مشرک ہو چکے ہو، اِس قابل نہیں ہو کہ ابراہیمؑ کی طرف اپنی نسبت کرو۔ اُس کے راستے پر تو تم نہیں بلکہ ہم (یعنی اُمتِ محمدیہ ؐ) چل رہے ہیں۔ تمام پیغمبروں اور اُن پر نازل ہونے والی کتابوں پر تو ہم ایمان رکھتے ہیں، جس کسی کی طرف سے بھی ملے اور جس کتاب میں بھی آئے ہر حق کے آگے سر جھکاتے ہیں لہٰذا ہم زیادہ مستحق ہیں ابراہیمؑ کی طرف نسبت کرنے کے۔

فَإِنْ ءَامَنُوا۟ بِمِثْلِ مَآ ءَامَنتُم بِهِۦ فَقَدِ ٱهْتَدَوا۟ ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا۟ فَإِنَّمَا هُمْ فِى شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ ٱللَّهُ ۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

(۱۳۷)۔ اور اگر یہ ویسا ہی ایمان لے آتے ہیں جیسا تم لے آئے ہو تو ہدایت یافتہ ہوں گے اور اگر روگردانی کر لیتے ہیں تو سمجھو کہ ایسے اختلاف میں پڑ چکے کہ حتمًا اللہ اِن کے مقابل تمہارے لئے کافی ہے اور وہ (اللہ) خوب جاننے والا سننے والا ہے۔

(۱۳۷)۔ اِس آیتِ مبارکہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب کی مذہبی علماء کے تبلیغات کو اہمیت نہ دیں، یہ راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ یہ صرف اُس صورت میں راہ راست پر سمجھے جا سکتے ہیں جب اِن کا عقیدہ اور عمل مومنوں کی طرح ہو جائے۔ اِن کی مخالفتوں اور دشمنی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کافی ہے، وہ اِن کی مخالفانہ باتیں اور آپ کی دعوت حق سن رہا ہے، تمہاری حالت سے بھی خوب واقف ہے اور اِن کی حالت سے بھی۔

صِبْغَةَ ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُۥ عَٰبِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَآجُّونَنَا فِى ٱللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ أَعْمَٰلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَٰلُكُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾

(۱۳۸)۔ (اسی طرح کہو) ہم نے الہٰی رنگ اختیار کیا ہے اور اللہ سے بہتر رنگ اور کس کا ہو گا اور ہم اُس کی عبادت کرتے ہیں (۱۳۹) اِنہیں کہو: کیا ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں اُلجھتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اور (یہ کہ) ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال اور ہم تو اُسی کے لئے مخلص ہیں۔

(۱۳۸)۔ نصرانیوں نے دوسری جاہل اقوام کی طرح اللہ کے دین پر عمل ترک کیا اور دین کے نام پر چند ایسی خود ساختہ مضحکہ خیز رسمیں ایجاد کر لیں جن کے بارے میں اُن کا گمان تھا کہ اُن کی بدولت اللہ اُن کے تمام گناہوں سے درگزر کرلے گا اور اُن کے سامنے جنت کے تمام دروازے کھول دے گا۔ وہ رسمیں کچھ یوں تھیں کہ جب اُن کے ہاں بچے کی ولادت ہو جاتی تھی تو اُسے زرد رنگ کے پانی میں غوطہ

دے دیتے تھے جس سے وہ پکا مسیحی اور عیسیٰ علیہ السلام کا مخلص امتی بن جاتا تھا۔ اتنا پکا اور مخلص کہ اِس کے بعد کوئی گناہ اُس سے یہ اعزاز نہیں چھین سکتا تھا اور کوئی عمل اُسے جنت سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ ہفتے میں ایک دن (اتوار کو) کلیسا جانا، ایک ترانہ پڑھنا، سینے پر ہاتھ کے اشارے سے صلیب بنانا، یہی کافی ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اُن کو جنت میں داخل کر دے۔ اِس کے بعد شرک، شراب، سود، زنا، سور کا گوشت، دوسرے کے حق پر ڈاکہ غرض کسی بھی گناہ کو محو کرنے کے لئے وہی زرد رنگ کے پانی کا بپتسمہ کافی تھا۔ مومنوں کو کہا گیا کہ: اِن گمراہ اور بے عقل اہلِ کتاب سے کہیں: کہ الٰہی رنگ میں رنگے جانا اپنے اندر اُن صفات کے پیدا کرنے کو کہتے ہیں جو اللہ کو پسند ہوتی ہیں۔ پوری زندگی ایک ایسے سانچے میں ڈھالنے کو کہا جاتا ہے جس سے ہر موقع اور موڑ پر الٰہی دین کے رنگ ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ دعائیں اور عبادات صرف ایک اللہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں اور اُن میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نظر نہیں آتی۔

(۱۳۹)۔ اس حال میں کہ ہم بھی اُسی اللہ پر یقین رکھتے ہیں جس پر ایمان کے تم بھی دعویدار ہو اور اِس حال میں کہ ہمیں ہمارے اعمال کی سزا دی جائے گی اور تمہیں تمہارے اعمال کی اور اِس حال میں کہ ہم نے اپنی عبادات کو شرک کی ہر آلودگی سے پاک رکھا ہے، ہمارے ساتھ تمہاری مخالفت اور دشمنی کی وجہ ہی کیا رہ جاتی ہے؟

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطَ كَانُواْ هُودًا أَوْ نَصَـٰرَىٰ ۗ قُلْ ءَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ ٱللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَـٰدَةً عِندَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَـٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾

(۱۴۰)۔ کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد یہودی اور نصرانی تھے؟ اِنہیں کہو: تم بہتر جانتے ہو یا اللہ؟ اور اُس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اپنے پاس موجود کوئی الٰہی شہادت چھپا لے؟ اور اللہ تو تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔

---

(۱۴۰)۔ یہود اور نصاریٰ دونوں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اُن کا مذہب وہی ہے جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اُن کی اولاد کا تھا مگر اِس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ حقیقت کیا ہے؟ اِس کو دونوں ہی چھپاتے تھے اور دونوں اپنے اعمال میں دین سے دور نکل گئے تھے، نہ تو اُن کا عقیدہ درست تھا اور نہ ہی عمل۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

(۱۴۱)۔ وہ تو ایک گروہ تھا جو گزر گیا، اُن کے لئے اُن کے ہاتھ کی کمائی ہے اور تمہارے لئے تمہاری اور تم سے اُن کے کرتوتوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

---

(۱۴۱)۔ یہ مختصر آیت اِس مبارک سورت کے دوسرے حصے کا عنوان ہے اور اُن تمام جامع اور گہرے مطالب کا خلاصہ پیش کرتی ہے جو ما قبل کی ۷۱ آیات میں تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ اِس میں نہ صرف دین کے ایک بنیادی اُصول کی وضاحت کی گئی ہے بلکہ مذہبی انحراف کے ایک اساسی اور بنیادی پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے ذاتی اعمال کی سزا پائے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا، نہ کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا دی جا سکتی ہے۔ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے قصور میں پکڑا جائے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے اچھے اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخل ہو گا، ہر کوئی اپنے ہاتھ کی کمائی کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہو گا۔ مذہبی انحراف کا اساسی اور بنیادی پہلو یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو اللہ کے صالح بندوں سے کسی نسبت یا تعلق کی بنیاد پر جنت کا مستحق اور مذہب کا وارث سمجھ بیٹھے اور اِس بنیاد پر معاشرے سے امتیازات حاصل کرنے کی خواہش یا تگ و دو کرے۔ یہی حالات ہوتے ہیں جن میں مذہب قومی رنگ اختیار کر لیتا ہے قومی تعصب کو مذہب کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے اور مذہبی پیشوا اپنے آپ کو انبیاء کے امتیازات کے وارث بنا لیتے ہیں نہ کہ اُن کی مسئولیتوں اور ذمہ داریوں کے وارث۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی اپنے ٹیڑھے عقائد اور گندے افعال کی نسبت اُس کے نیک بندوں کی طرف کر کے مذہب کا نام بھی بدنام کرے اور اللہ کے صالح بندوں کا بھی۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی رہنمائی فرماتا ہے کہ زمانۂ سلف کے صالحین کے ناموس کے لئے جاہلوں کے زیادہ منہ نہ لگیں اور بے فائدہ کے تنازعات اور مناظروں میں مصروف نہ رہا کریں بلکہ اِس کے برعکس یہی توانائی اپنے اعمال درست کرنے میں صرف کریں۔ تم کو عذاب سے چھڑانے والا تو تمہارا عمل ہے نہ کہ کچھ اور۔

یہ مسئلہ نہ صرف مکہ اور مدینہ میں مشرکین اور یہود کے ساتھ وجہ نزاع تھا بلکہ اب بھی اکثر مذہبی اختلافات اِسی ذہنیت سے سیراب ہوتے ہیں کہ پہلے سے مانی اور جانی ہوئی شخصیات کے ساتھ اپنا اپنا تعلق اور نسبت قائم اور ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی اپنے آپ کو پیغمبر علیہ السلام کا اہل بیت، محب اور وارث سمجھتا ہے اور آپؐ کے بعد علی رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد کو آپؐ کے جانشین اور خلافت کے اصل اور تنہا وارث کہتے ہیں۔ نیز ابو بکر، عمر اور عثمانؓ سمیت اُن تمام صحابہ کرام کو جنھوں نے علیؓ کے علاوہ کسی اور کی کبھی بیعت کی ہے اور اُس کی خلافت پر راضی رہے ہیں، غاصب سمجھتے ہیں۔ جبکہ امر واقع تو یہ ہے کہ علیؓ نے تو خود بھی اپنے سے قبل خلفاء کی بیعت کی ہے بلکہ عمرؓ کو تو اپنی ایک بیٹی بھی نکاح میں دی تھی۔ محرم کے دنوں میں تو امام حسین رضی اللہ

عنہ کے لئے کالے کپڑے پہن کر کربلا میں اُن کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں مگر کربلا اور نجف پر صلیبی افواج کی یلغار کے وقت عملی طور پر ساتھ غاصبوں کا دینے لگ جاتے ہیں اور اُن کے ہاتھوں اُن ہزاروں مسلمانوں کے قتل کی کوئی پروا نہیں کرتے جو امام حسین کی طرح ظلم اور سرکشی کے مقابلے پر کمربستہ تھے۔ یزید پر تو لعنت بھیج رہے ہوتے ہیں مگر عملاً یزید سے کئی گنا زیادہ ظالم حکمرانوں کی مدد اور بے دین، منافق، ظالم اور مفسد سرداروں کی بیعت کرتے ہیں!!

اگر پیغمبر علیہ السلام کی زندگی میں عراق اور افغانستان میں اتنے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا ہوتا تو ذرا سوچیں کہ اُن کا دردمند دل شہدائے کربلا سے زیادہ اِن شہیدوں کے لئے نہ تڑپا ہوتا؟

۞ سَيَقُولُ ٱلسُّفَهَآءُ مِنَ ٱلنَّاسِ مَا وَلَّىٰهُمۡ عَن قِبۡلَتِهِمُ ٱلَّتِي كَانُواْ عَلَيۡهَاۚ قُل لِّلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُۚ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةٗ وَسَطٗا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيدٗاۗ وَمَا جَعَلۡنَا ٱلۡقِبۡلَةَ ٱلَّتِي كُنتَ عَلَيۡهَآ إِلَّا لِنَعۡلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيۡهِۚ وَإِن كَانَتۡ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٞ رَّحِيمٞ ﴿١٤٣﴾

(۱۴۲)۔ عنقریب لوگوں میں سے ناسمجھ کہیں گے: اِن کو کس چیز نے اپنے اُس قبلے سے برگشتہ کر دیا جس کے یہ (معتقد) تھے، اُنہیں کہو: مشرق اور مغرب (دونوں) اللہ کے ہیں۔ صراط مستقیم کی ہدایت اُنہی کو کرتا ہے جن کے لئے وہ خود چاہے۔ (۱۴۳)۔ اور اِس طرح ہم نے تمہیں ایک ''امتِ وسط'' قرار دیا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد بنو اور پیغمبر تم پر شاہد ہو۔ اور تمہارا پہلا قبلہ اِس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے مقرر نہیں کیا گیا تھا، کہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون پیغمبر کی متابعت کرتا ہے اور کون اُلٹے قدموں پھر جاتا ہے۔ یہ ہے تو یقیناً مشکل کام، مگر (اُن کے لئے نہیں) جن کو اللہ نے ہدایت پر رکھا ہو۔ اور اللہ تمہارے اعمال کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ یقیناً اللہ لوگوں پر نہایت مہربان رؤف ہے۔

(۱۴۲۔۱۴۳)۔ اِس آیتِ مبارکہ سے اِس سورت کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے لے کر سورت کے آخر تک زندگی کے مختلف النوع معاملات اور نزاعات کے بارے میں متفرق احکامات بیان کئے گئے ہیں جن کی ابتداء تحویلِ قبلہ کے حکم سے کی گئی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام مکہ اور مدینہ میں اِس آیت کے نزول تک نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے کھڑے ہوتے تھے،

حالانکہ قریش کا قبلہ کعبہ تھا۔ باپ دادا کا قبلہ چھوڑ کر کعبہ کے بجائے بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا اور پھر دوبارہ اُس کو چھوڑ کر کعبہ کو بطور قبلہ اپنانے نے آپؐ کو شدید اعتراضات سے دوچار کر دیا۔ اِن مبارک آیات میں معترضین کو جواب دیا جا رہا ہے کہ:

- مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں، قبلہ اُس کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، یہ اُس کی مرضی ہے کہ کس کے لئے کون سا قبلہ مقرر کرتا ہے۔
- تمہارے اندر یہ انفرادیت اور استعداد نہیں رہی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت سے نواز دے۔
- مسلمانوں کے لئے نیا قبلہ مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلے کا اظہار ہے کہ آئندہ کے لئے ہدایت کا مرکز کعبہ کی طرف منتقل ہو گیا اور اب دینی قیادت کا اعلیٰ مقام مسلمانوں کے حوالے ہے۔
- اِس کے بعد ہدایت کی شمع مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گی اور اُنہی کا عمل حق کے اثبات کی دلیل قرار پائے گا۔ لوگ حقیقی دین، اللہ کے بارے میں درست عقیدے، عبادت کے درست طریقے اور ایک حقیقی مسلم بندے کی زندگی کے تعین کا فیصلہ اُنہی کو دیکھ کر کریں گے۔ اُن کی شخصیت، اُن کی فکر اور عقیدہ اور اُن کی عملی زندگی دوسروں کے لئے شاہد کی حیثیت کی حامل ہو گی اور مسلمانوں کے لئے پیغمبر کی حیثیت شاہد کی ہو گی۔
- پہلے ہم نے کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کیا یہ لوگ پیغمبر کی متابعت میں اپنے باپ دادا کا قبلہ چھوڑنا گوارا کرتے ہیں اور یہ کہ کیا ایمان کی خاطر تمام قومی اور لسانی عصبیتوں کو لات مارنے پر تیار ہیں؟
- اِن کو تسلی رہنی چاہئے کہ پہلے والے قبلہ کے بارے میں اِن کا یقین اور اعتقاد اور اُس اعتقاد کی بنیاد پر اُن کی ادا کی گئی نمازوں کے ضائع ہونے کا کوئی خدشہ نہیں، اللہ لوگوں کے لئے رافت (ملاطفت) اور رحمت (نوازش) رکھتا ہے۔
- واضح رہنا چاہئے کہ بعض لوگوں نے اس آیت (وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ: اور اللہ تمہارے ایمان ضائع نہیں کرتا) کی تفسیر میں ایمان کو نماز کے معنی میں لیا ہوا ہے جو کہ یقیناً ایک احتمالی مگر کمزور تفسیر ہے، بہتر تفسیر یہ ہے کہ یہاں ایمان اپنے اصل معنٰی میں لے لیا جائے۔ اِس لئے کہ قبلہ پر یقین رکھنا ایک عقیدہ ہے، بیت اللہ کی جگہ بیت المقدس کو بطور قبلہ قبول کرنا اور اپنے باپ دادا کے قبلے کو چھوڑنا عربوں کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ مسلمان اِس آزمائش میں سرخرو ٹھہرے، اپنا خاندانی قبلہ چھوڑ کر ایک ایسے حال میں بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کر لیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی باقاعدہ حکم نازل بھی نہیں ہوا تھا۔ اُنہوں نے صرف اِس وجہ سے بیت المقدس کو قبلہ تسلیم کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے قبل تک آنے والے انبیاء (سلیمان علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک) کا یہی قبلہ تھا۔ اِس آیت میں اُنہیں کہا گیا ہے کہ تمہارا وہ پہلے والا یقین اور اجر اللہ کے ہاں حبط اور ضائع نہیں ہوا ہے، اللہ اُسے ضائع نہیں کرتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو نمازوں کے ضائع نہ ہونے کی بات کرنی ہوتی تو ایمان کی جگہ لازماً نماز کا صیغہ لا کر بات کی گئی ہوتی۔

- پیغمبر کی متابعت میں اپنے باپ دادا کا قبلہ چھوڑ کر دوسری طرف رخ کرنا اور پھر اُسے دوبارہ چھوڑنا، یہ مشکل کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی نصیب ہو چکی ہوتی ہے۔

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَىٰهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ ۗ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾

(۱۴۴)۔ ہم تو آسمان کی طرف تمہارا نظریں اُٹھاتے رہنا دیکھ رہے ہیں پس ضرور بالضرور تمہیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو۔ تو اپنا رُخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لو اور جہاں کہیں بھی تم ہو اُس کی طرف رُخ کر لیا کرو اور بے شک اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے ایک حقیقت ہے اور اللہ اُن کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

(۱۴۴)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو تحویلِ قبلہ کی اُمید تھی۔ آپؐ چاہتے بھی یہی تھے کہ آپؐ کے لئے بیت المقدس کے بجائے کعبہ قبلہ قرار دیا جائے اور دل میں یہ تمنا رکھتے تھے کہ کاش اِس بارے میں الٰہی فیصلہ آ جائے۔

اہلِ کتاب جانتے تھے کہ آخری پیغمبر کا قبلہ کعبہ ہو گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہر پیغمبر کے لئے اُس کی دعوت اور اُمت کے علاقے میں قبلہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اُن کے اختلاف کی وجہ نادانی نہیں تھی بلکہ اُن کے کرتوت اور اعمال اُن کو اِس اختلاف پر اُبھار رہے تھے۔ اِس اختلاف کی پشت پر اُن کے ناجائز اور گندے مقاصد کار فرما تھے جو اُن کے مذہبی اور قومی تعصب کے پیدا کردہ تھے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ بِكُلِّ ءَايَةٍ مَّا تَبِعُوا۟ قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٤٥﴾ ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَٰهُمُ ٱلْكِتَٰبَ يَعْرِفُونَهُۥ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ ٱلْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾

(۱۴۵)۔ اور اہلِ کتاب کو تم جو بھی دلیل پیش کرو گے، وہ تمہارے قبلے کی متابعت نہیں کریں گے اور تم بھی اُن کے قبلے کی متابعت کرنے والے نہیں ہو اور یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلے کی متابعت کرنے والے نہیں ہیں اور بعد اِس کے کہ تمہیں (اِس بارے میں) ضروری علم دے دیا گیا، اگر تم نے اِن کے خواہشات کی متابعت کی، تو یقیناً تم ظالموں میں سے ہو گے۔ (۱۴۶) وہ لوگ

جنہیں کتاب دی گئی ہے، اِسے اِس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر اِن کا ایک گروہ حق کو اِس حال میں چھپاتا ہے کہ وہ (خوب) جانتا ہے۔

(۱۴۵۔۱۴۶)۔ اہلِ کتاب تمہارا قبلہ نہیں مانتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق جاننے کے بعد اپنی غرض اور مرض کی وجہ سے اعتراضات پر اُتر آئے ہیں۔ پس یہ دلائل سے قائل ہونے والے نہیں اِس لئے اِن پر اپنی توانائیاں ضائع نہ کرو اور یہ گمان بھی نہ رکھو کہ اِن کا قبلہ مان لینے پر یہ تمہاری مخالفت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ تحویلِ قبلہ سے قبل بھی یہ تمہاری مخالفت پر کمربستہ تھے اور اب بھی ہیں۔ یہ اپنی خواہشات کے غلام ہیں لہٰذا کوئی اور بھی اِن کی متابعت کرے گا تو اُس کا ایک ہی طریقہ اور معنیٰ ہے اور وہ یہ کہ اِن کی ہویٰ وہوس کی پیروی کی جائے جو کہ حق وحقیقت پر بھی ظلم ہے اور اپنے آپ پر بھی۔

ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡمُمۡتَرِينَ ﴿١٤٧﴾ وَلِكُلٍّ وِجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ۖ فَٱسۡتَبِقُواْ ٱلۡخَيۡرَٰتِ ۚ أَيۡنَ مَا تَكُونُواْ يَأۡتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿١٤٨﴾

(۱۴۷)۔ حق وہی ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے تو شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ (۱۴۸) اور ہر کسی کے لئے (رُخ کرنے کا) ایک قبلہ مقرر ہے جس کا وہ اہتمام کرتا ہے، پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کیا کرو۔ جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تم سب کو اکٹھا کر لے گا بے شک اللہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔

---

(۱۴۷)۔ اہلِ کتاب کی مخالفت اور اعتراضات تمہیں شک میں ڈالنے نہ پائیں، اللہ تعالیٰ نے قبلے کے بارے میں جو حکم دیا ہے یہی حقیقت ہے۔

(۱۴۸) قبلہ تو صرف ایک رمز ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کرنے کا رمز۔ اصل چیز تو خیر اور بھلائی کی طرف پیش رفت ہے تو تم اُسی میں مسابقت کرو اور اِن کے ساتھ قبلے کی بابت بحث ومباحثے سے اجتناب کرو۔ اِس کا کوئی فائدہ نہیں، نہ یہ تمہارا قبلہ مانتے ہیں اور نہ تم اِن کا۔ اِس کے بجائے خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لئے آگے بڑھو۔ اس آیتِ مبارکہ میں نہ صرف یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے جمع کرنے پر قادر ہے بلکہ اِس کو قبلے کی بحث کا حصہ بنا کر اِس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ قبلے کی تقرری کو اللہ تعالیٰ اُمت کی وحدت اور مجتمع کرنے کا وسیلہ بناتا ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُۥ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَٱخْشَوْنِى وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِى عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

(۱۴۹)۔ اور جہاں کہیں سے بھی (نماز کے لئے) نکلو تو اپنا رُخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیا کرو۔ یقیناً یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک حقیقت ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ (۱۵۰) اور جہاں کہیں سے نکلو تو اپنا رُخ مسجد الحرام کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں بھی تم ہو تو رُخ اُس کی طرف پھیر لو تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف اعتراض کا موقع نہ رہے، سوائے اُن لوگوں کے جو اِن میں سے ظالم ہیں، تو اِن سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اِس لئے کہ تم پر اپنی نوازشات پوری کر دوں اور اِس لئے کہ تمہیں ہدایت نصیب ہو جائے۔

(۱۴۹۔ ۱۵۰)۔ جہاں کہیں بھی آپ ہوں، سفر میں ہوں یا حضر میں، اکیلے ہوں یا اکٹھے، نماز میں قبلے کی طرف رُخ کر لیا کریں۔ حق پرست تمہارے قبلے پر اعتراض نہیں کرتے، ضدی اور کینہ پرور مخالفین کے (اغراض میں لپٹے ہوئے) اعتراضات کی پروا نہ کرو اور صرف اپنے رب سے ڈرو۔ تحویلِ قبلہ در حقیقت تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نوازش ہے، وہ چاہتا ہے کہ راہِ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرے۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا۟ تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَٱذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُوا۟ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

(۱۵۱)۔ جس طرح کہ ہم نے تمہی میں سے تمہارے اندر ایسا پیغمبر بھیج دیا جو تمہیں میری آیات (پڑھ کر) سناتا ہے، تمہاری تربیت کرتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔(۱۵۲)۔ تو تم مجھے یاد کرو کہ میں تمہیں یاد کروں اور میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔

(۱۵۱۔۱۵۲)۔ تمہارے علاقے میں اور پھر اُس کے ایک مرکزی شہر میں تمہارے لئے قبلہ مقرر کرنا اُسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے خود تمہی میں سے ایک پیغمبر تمہارے لئے مبعوث کیا اور اُسی پیغمبر کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے تم دنیا کی سب سے بہتر اُمت اور سب کے لئے شاہد قرار پاگئے۔ تو اللہ تعالیٰ کی اِن بڑی بڑی نوازشات کا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔

لازم ہے کہ قبلے کی بحث کے اختتام پر، یہ جاننے کی کوشش کریں کہ قبلہ کسے کہتے ہیں، اِس کا ہدف کیا ہے اور نماز میں قبلے کی طرف منہ کرنے کا مفہوم کیا ہے:

ذرا غور کریں، آپ روزانہ کئی کئی مرتبہ، دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ مل کر، ایک خاص مقام کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے ہیں جو آپ کا مشترکہ قبلہ ہے۔ یہ جگہ اللہ کا گھر (بیت اللہ) ہے، یعنی تم اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر باری باری اللہ جل جلالہٗ کے گھر کی طرف رخ کرتے ہو جو عملاً اِس عزم کے اعلان کا اظہار ہے کہ: میں اللہ جلَ جلالہٗ کے گھر کے سوا کسی دوسرے گھر کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، نہ کسی دوسرے در پر دستک دیتا ہوں اور نہ ہی کسی اور سے پناہ مانگتا ہوں۔

تمہیں روز ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کا قبلہ اللہ جل جلالہ کا گھر نہیں بلکہ دنیا کے حکمرانوں کے محلات ہوتے ہیں۔ اُن کا رخ اُن محلات کی طرف، اُمیدیں اُن محلات سے وابستہ، طواف اُن محلات کا، دلوں میں خوف اُنہی محلات کے باسیوں کا، اور اُن کے دماغ پر تسلط بھی اُنہی کی بڑائی اور عظمت کا ہوتا ہے۔

افسوس ہے، ایسے لوگ کتنے عام ملتے ہیں جن کا رُخ بظاہر تو اللہ کے گھر کی طرف ہوتا ہے مگر در حقیقت اُن کے دلوں کے قبلے اور ہوتے ہیں۔ جب اُن کا رُخ بیت اللہ کی جانب ہوتا ہے ٹھیک اُسی وقت اُن کے دل دوسرے قبلوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

جو شخص دن میں پانچ مرتبہ شعوری طور پر اپنی سوچوں کو اِس حقیقت پر مرتکز کرکے حقیقی معنوں میں قبلہ رو کھڑا ہوتا ہے کہ وہ زمین، آسمانوں اور تمام عالم کے رب کے گھر کی طرف رخ کر رہا ہے اور اُس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، کیا ممکن ہے کہ وہ اُس کے بعد کبھی کسی دوسرے چوکھٹ پر کھڑا ہو جائے اور کسی اور گھر کا طواف کرلے۔

کسی کے گھر کا مشترک ہونا گھر والوں کے اتحاد کا باعث بنتا ہے اور اُن میں یگانگت اور وحدت کا احساس بیدار کرتا ہے۔ کسی ایک گھرانے کے افراد اِسی لئے ایک گھرانہ اور ایک مُٹھی ہوتے ہیں کہ اُن کا گھر مشترک ہوتا ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد بھی علیٰحدہ علیٰحدہ گھر میں بس جانے کے باعث ایک دوسرے سے رفتہ رفتہ اتنے دور ہو جاتے ہیں جتنے پرائے۔

سب کے ساتھ مل کر اللہ کے گھر کی طرف رُخ کرنا اور ایک ہی معبود کی چوکھٹ پر کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا قبلے کا بھائی تمہارا بھائی اور تمہارے وسیع تر دینی گھرانے کا فرد ہے۔

اکثر لوگ قبلے کی درست سمت معلوم کرنے میں انتہائی احتیاط اور دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ کبھی تو جیب میں قطب نما بھی رکھتے ہیں لیکن اگر اُن کے دلوں کی کیفیت معلوم ہو جائے تو اُن کے دلوں کے قبلے کی کجی دیکھ کر سمجھ جاؤ گے کہ وہ معنوی لحاظ سے کتنے مختلف رُخ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

تقویٰ کے بعض مدعی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے تخمینے سے چند سنٹی میٹر بھی ادھر اُدھر رُخ کر کے کھڑے ہونے والے نمازی کی اُسی لمحے تکفیر کرنے میں دیر نہیں لگاتے حالانکہ قبلے کے مالک خدا کا تو اُن لوگوں کے لئے جن کی نیت درست ہو اور اپنی بساط بھر احتیاط کر چکے ہوں، فرمان ہے کہ:

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَ جْه الله ۚ: البقرة ١١٥

توجس طرف بھی تم رخ کرلو، اللہ اُسی سمت میں ہے۔

غیر یقینی حالات میں تو اپنے یقین کی بنیاد پر جس طرف بھی رخ کر کے نماز پڑھ لی جائے، قبول ہوتی ہے۔ اگرچہ اِس بات کا احتمال موجود ہو کہ شاید آپ غلط رخ پر کھڑے ہو کر پڑھ چکے ہوں۔ بعض لوگوں کے لئے چھوٹے چھوٹے، جزئی اور فروعی مسائل میں اختلاف کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ جاری کرنا اور ایسی صورت میں اپنے ہم قبلہ بھائی کے خلاف کچھ بھی کہنا اور کرنا کتنا آسان ہے؟ حالانکہ ہم قبلگی کی عظمت محسوس کرنے کے لئے، قبلہ کے رمز شناس، ہمارے امام ابو حنیفہؒ کے بات کرنے کا اسلوب ملاحظہ کریں۔ کہتے ہیں: لا نكفر اهل قبلتنا: ہم اپنے اہلِ قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے۔

افسوس کا مقام ہے کہ اشتراکِ قبلہ سے علیم اور حکیم اللہ کا اتحادِ اُمت کا عظیم مقصد اور ہدف جانتے ہوئے بھی جاہل اور ناسمجھ لوگوں نے اِسے اختلاف اور افتراق کا وسیلہ بنایا ہوا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُولُواْ لِمَن يُقۡتَلُ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمۡوَٲتُۢۚ بَلۡ أَحۡيَآءٌ وَلَـٰكِن لَّا تَشۡعُرُونَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبۡلُوَنَّكُم بِشَىۡءٍ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ وَٱلۡجُوعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ ٱلۡأَمۡوَٲلِ وَٱلۡأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٲتِۗ وَبَشِّرِ

ٱلصَّـٰبِرِينَ ﴿١٥٥﴾ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَـٰبَتۡهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓاْ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُوْلَـٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۖ وَأُوْلَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

(۱۵۳)۔اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد (تقویت) حاصل کرو، اللہ یقیناً صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(۱۵۴)اور جو اللہ کے راستے میں مارے جاتے ہیں، اُنہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم جانتے نہیں۔(۱۵۵)ہم ضرور تمہیں کچھ نہ کچھ خوف، بھوک، جان و مال کے نقصان اور پھلوں (حاصلات) کی کمی اور گھاٹے سے آزمائیں گے تو صابروں کو خوش خبری سنادو۔(۱۵۶)۔ اُن (صابرین) کو جنہیں کبھی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔(۱۵۷)۔یہ وہ گروہ ہے جس پر اپنے رب کی طرف سے صلوات (درود) اور رحمتیں ہیں اور یہی ہدایت پانے والے ہیں۔

(۱۵۳۔۱۵۷)۔اِن مبارک آیات میں مومنوں کی رہنمائی کی گئی ہے کہ:

- صبر اور نماز کے ذریعے تم اللہ کی مدد حاصل کرسکتے ہو، اللہ صابرین کی دستگیری اور مدد فرماتا ہے۔
- شہداء کو نہ تو مردہ سمجھو اور نہ اُنہیں مردہ کہو۔نہ تمہارے ذہن میں یہ خیال آنے پائے کہ وہ مر چکے اور نہ ہی زبان پر۔وہ زندہ ہیں مگر تم اُن کی اِس زندگی کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے۔
- تمہیں علم ہونا چاہیے کہ اللہ کا راستہ آزمائشوں سے پٹا پڑا ہے، اللہ کو پانا اور اُس کی رضا حاصل کرنا آسان اور سستا کام نہیں ہے۔اِس راستے میں جان و مال اور گھر بار کا نقصان ایک شُدنی امر ہے اور اِس میں خوف اور بھوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے لیکن اگر صبر سے کام لیتے رہے تو اِس راستے کا ہر کانٹا پھول بن جائیگا۔کامیابی کی خوشخبری اُس کے حصے میں آتی ہیں جو صابر ہوتا ہے، پُرعزم ہوتا ہے اور خندہ پیشانی سے اللہ کے راستے کی مشکلات برداشت کرتا ہے۔
- صابر وہ ہے جو مشکلات کا سامنا کرنے کی صورت میں یہ موقف رکھتا ہے کہ: ہمارا سب کچھ اللہ کا ہے، اُسی کا دیا ہوا ہے، وہ اُنہیں واپس لینے کا حقدار ہے۔ اللہ کے راستے میں اِن کو قربان کرنا ایسے ہے جیسے کسی کی امانت اُسے واپس لوٹا دی جائے۔ اللہ کی طرف لوٹنا تو ہے ہی، موت سے نجات تو ممکن نہیں، کیوں نہ اُس کی راہ میں جان دے دی جائے تاکہ سر اُٹھا کر اُس کی طرف لوٹ جائیں۔اِس حال میں کہ اپنا سب کچھ اُسی کی راہ میں وقف کر چکے ہوں۔

- ایسے صابرین کے ساتھ اللہ تین چیزوں کا وعدہ کرتا ہے: اللہ اُن کی تعریف کرے گا، اُنہیں اپنی رحمت اور نوازشوں میں لپیٹ لے گا اور اپنی ہدایت کے دروازے اُن پر کھول دے گا۔

۞ إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

(۱۵۸)۔ یقیناً صفا اور مروہ اللہ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی بیت (اللہ) کا حج کرے یا عمرہ ادا کرے تو اِن کا طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی اپنی مرضی سے خیر کا کوئی کام کرلے تو اللہ خوب جاننے والا شاکر ہے۔

(۱۵۸)۔ صفا اور مروہ وہ دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو بھوک پیاس اور موت سے بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی اُس مخلص بندی نے، جس نے ابراہیم علیہ السلام کو رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ: ہمیں اللہ کے حکم کی تعمیل میں یہاں اِس ویرانے میں چھوڑ رہے ہو، میں اُس کے حکم کے تعمیل پر راضی ہوں، وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ پس اللہ نے اُس کی یہ سعی مناسک حج میں سے قرار دی اور بیت اللہ کے تمام حج اور عمرہ ادا کرنے والوں کو قیامت تک اِس کا مکلف ٹھہرایا کہ اللہ کے گھر آنے کے موقع پر ہاجرہؓ کی یاد تازہ کریں گے اور اُنہی کی طرح اِن دو پہاڑیوں کے درمیان سعی کریں گے۔ یہ اِس لئے کہ اللہ جاننے والا اور شاکر ہے۔ اپنے مخلص بندوں کو جانتا بھی ہے اور اُن کے اخلاص کی قدر بھی کرتا ہے۔ اِس سے پہلے والی آیت میں صبر اور صبر کرنے والوں کے اجر کا ذکر آیا ہے اور یہاں صفا اور مروہ کا ذکر کرکے اُس کے لئے تاریخی مثال پیش کی گئی۔ یہ صبر کرنے والی ایک بندی کی مثال ہے ملاحظہ کریں کہ اللہ صبر کرنے والوں کی کس طرح عزت افزائی کرتا ہے۔

اگرچہ یہاں صفا اور مروہ کا ذکر اِس بات کے لئے ایک مثال کے طور پر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صابر بندوں کی قدردانی اور تمجید کرتا ہے مگر یہ ذکر ایسے اسلوب اور ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اِس کے ضمن میں مدینے کے اُن لوگوں کی تشویش کو بھی رفع کر دیا گیا ہے جو صفا اور مروہ پر مشرکین کے بت نصب کرنے کی وجہ سے اِن مقامات کے سعی کو گناہ سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرما دیا ہے کہ اِن کا طواف کرنے میں گناہ کا احساس نہ کرو۔

اِس کے بعد والی آیات میں بے صبر لوگوں کا بُرا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اُن لوگوں کا بُرا انجام جو حق کے دفاع کی ذمہ داری کے دوران بجائے صبر سے کام لینے کے کتمان حق کے مرتکب ہوتے ہیں اور اِس طرح ایک قلیل متاع کے حصول کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلْهُدَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِى ٱلْكِتَٰبِ ۙ أُو۟لَٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ ٱللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ ٱللَّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ وَأَصْلَحُوا۟ وَبَيَّنُوا۟ فَأُو۟لَٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كُفَّارٌ أُو۟لَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ ٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ ٱلْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحْمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾

(۱۵۹)۔ واضح آیات اور ہدایات میں سے جو کچھ ہم نے نازل کیا ہے، جو کوئی اُنہیں چھپاتے ہیں، بعد اِس کے کہ ہم نے لوگوں کے لئے اُنہیں کتاب میں بیان کر دیا ہے، تو یقیناً اُن لوگوں پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے، اور دوسرے لعنت بھیجنے والے بھی سب لعنت بھیجتے ہیں۔ (۱۶۰)۔ مگر وہ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی کارکردگی کی اصلاح کر لی اور بیان کر ڈالا، تو میں اُن کی توبہ قبول کر لوں گا اور میں تو یقیناً نہایت مہربان توبہ قبول کرنے والا ہوں۔ (۱۶۱) بے شک وہ جو کافر ہوئے اور اِس حال میں مر گئے کہ کافر ہی رہے، اُن پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی طرف سے لعنت ہے۔ (۱۶۲) ہمیشہ اِسی میں پڑے رہیں گے، نہ ہی اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی اُنہیں مہلت دی جائے گی۔ (۱۶۳) اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اُس کے علاوہ دوسرا کوئی معبود نہیں۔ وہی نہایت مہربان رحم کرنے والا۔

(۱۵۹۔۱۶۳)۔ یہاں اُن دین فروشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حق کو چھپاتے ہیں اور اِس طرح فساد اور فتنے پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ اُن کا یہ کتمانِ حق اللہ تعالیٰ کے دین میں اتنا بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے کہ اسے اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کے لعنت بھیجنے کے قابل گردانا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ توبہ کریں، اپنے پھیلائے ہوئے فتنوں کی اصلاح کر لیں اور چھپائے گئے حقائق بیان کر دیں تو اُس صورت میں اللہ اُن کی توبہ قبول کر لے گا۔ اگر اِس کے بغیر یہ اپنی پہلے والی صورت میں مر جائیں تو اِسی طرح ہمیشہ اُس لعنت میں پڑے رہیں گے۔ غور کریں یہاں توبہ کی قبولیت کی تین شرائط بیان کی گئی ہیں: اپنے گناہوں سے واپس لوٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرنا، حق کو چھپانے کی وجہ سے جو فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اُن کی اصلاح اور تلافی اور چھپائے گئے حقائق کا برملا اظہار۔

إِنَّ فِى خَلْقِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَـٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ وَٱلْفُلْكِ ٱلَّتِى تَجْرِى فِى ٱلْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ وَمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مِن مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ ٱلرِّيَـٰحِ وَٱلسَّحَابِ ٱلْمُسَخَّرِ بَيْنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ لَـَٔايَـٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

(۱۶۴)۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُن کشتیوں میں جو سمندروں میں چلتی ہیں، وہ (چیزیں) لے کر جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل فرمایا ہے، جس کے ذریعے اُس نے مردہ زمین کو دوبارہ زندگی بخشی اور جس سے اُس میں قِسم قِسم کے جاندار پھیلا دیئے اور ہواؤں کی گردش میں اور آسمان اور زمین کے مابین مسخر کئے گئے بادلوں میں لازماً عقل والوں کے لئے واضح نشانیاں ہیں۔

---

(۱۶۴)۔ ایسے حال میں کہ زمین اور آسمان اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے، دن اور رات اُس کے ارادے سے آتے جاتے ہیں، سمندروں میں کشتیاں اُس کے حکم اور ارادے سے چلتی ہیں، آسمان سے پانی اُسی کے حکم سے اُترتا ہے، جس سے وہ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اور اُس میں غلہ اور پھل اُگاتا ہے اور قِسم قِسم کے جاندار اُس میں پیدا فرماتا ہے۔ ہوائیں اُسی کے حکم سے چلتی ہیں، بادل اُس کے حکم سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں تو اگر کسی میں سوجھ بوجھ ہے تو وہ کیوں کر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے امید اور خوف رکھے گا۔ کیوں اپنی رزق وروزی اور اپنی موت اور زندگی کے لئے اللہ کے علاوہ کسی اور پر انحصار کرے گا اور اِس خوف اور لالچ کی وجہ سے کتمانِ حق کا مرتکب ہوگا؟ ایسا تو وہ شخص کرتا ہے جو نہ تو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یہ سب کچھ اللہ کے اختیار اور قدرت میں داخل سمجھتا ہے۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ ٱللَّهِ ۖ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا۟ إِذْ يَرَوْنَ ٱلْعَذَابَ أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ ٱلَّذِينَ ٱتُّبِعُوا۟ مِنَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوا۟ وَرَأَوُا۟ ٱلْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

ٱلۡأَسۡبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُواْ لَوۡ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُواْ مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ ٱللَّهُ أَعۡمَٰلَهُمۡ حَسَرَٰتٍ عَلَيۡهِمۡ ۖ وَمَا هُم بِخَٰرِجِينَ مِنَ ٱلنَّارِ ﴿١٦٧﴾

(۱۶۵)۔ اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ اُس کے ایسے ہم سر ٹھہرا لیتے ہیں جن کے ساتھ وہ ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ شدید محبت اللہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور کاش یہ ظالم وہ کچھ سمجھ جائیں جو وہ عذاب ملنے پر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ یقیناً قدرت تمام کی تمام اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۱۶۶)۔ اُس وقت جب مقتداء اپنے پیروؤں سے بیزار ہوں گے اور عذاب دیکھیں گے اور اُن کے تمام تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ (۱۶۷) اور وہ لوگ جو پیروی کرتے تھے کہیں گے: کاش دوبارہ (دنیا میں) لوٹنا (نصیب) ہو جائے، تاکہ ہم اِن سے اِس طرح بیزار ہو جائیں جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو گئے، اِس طرح اُن کے اعمال اللہ اُن کے لئے حسرتیں بنا کر دکھا دے گا اور وہ آگ سے نکل نہیں سکیں گے۔

(۱۶۵۔۱۶۷)۔ بعض لوگ محبت میں شرک کرتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ محبت میں اُس کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک جان کر اُنہیں اُس کے ہمسر ٹھہرا لیتے ہیں اور اُن کے ساتھ اللہ کی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ مگر جو واقعی مومن ہیں وہ اللہ کے ساتھ دوسری ہر چیز سے زیادہ اور شدید محبت رکھتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ محبت ایمان کا تقاضا اور مومن کی نشانی قرار دی گئی ہے۔ کسی سے محبت یا تو اِس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ اُس سے کوئی فائدہ حاصل ہو چکا ہوتا ہے، وہ اِس کے ساتھ کوئی احسان کر چکا ہوتا ہے۔ یا اُس سے ایسی کوئی چیز حاصل کی ہوتی ہے جس کا یہ محتاج ہوتا ہے یا پھر اِس بنیاد پر کہ اُس کے اندر حسن وخوبصورتی اور کمال کی کوئی ایسی چیز دیکھی ہوتی ہے جس نے اُس کے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا ہوتا ہے کہ اُس کے جذبات واحساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہوتا ہے۔ اللہ کے ساتھ شدید محبت کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارے اوپر اُس کے احسانات اور نوازشیں ہر کسی سے زیادہ ہیں۔ اُسی نے ہمیں وہ سب کچھ دیا ہے اور ہمارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا ہے جس کے ہم محتاج تھے۔ اُس نے ہمیں زندگی بخشی ہے، رزق و روزی دیتا ہے اور ہماری پرورش کرتا ہے۔ ہمیں اُس سے اِس لئے بھی محبت ہے کہ اِس عالم میں حسن وخوبصورتی کے لاتعداد مظاہر اور آثار اُن کے خالق کے ساتھ ہماری محبت کو بیدار کرتے ہیں۔ ہم جدھر بھی نگاہ اُٹھاتے ہیں تو ہماری نظر حسن پر ہی پڑتی ہے، پھولوں، پودوں، پرندوں، پہاڑوں، دروں، دشتوں، آسمان کے ستاروں اور زمین و آسمان کی سب چیزوں میں حسن نظر آتا ہے۔ یہ حسن ہمارے دلوں میں جو جذبہ جگاتا ہے وہی اللہ سے محبت میں بدل جاتا ہے۔ جس طرح بعض لوگ محبت میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، اِسی

طرح کچھ دوسرے خوف میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ دوسروں سے اتنا ڈرتے ہیں جتنا ڈر صرف اللہ سے زیبا ہے۔ انسان اُس چیز سے ڈرتا ہے جو اُسے نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے جو اُس کی زندگی یا رزق وروزی میں کوئی اختیار یا تصرف رکھتی ہے۔ ہمیں زندگی اللہ نے دی ہے، رزق وروزی بھی وہی دیتا ہے اِس لئے چاہیے کہ ڈریں بھی صرف اُسی سے۔ جو لوگ دنیا میں ظالم اور مفسد سیاسی اور مذہبی لیڈروں کی قیادت پر مطمئن ہو گئے ہوتے ہیں یا اُنہوں نے اِس لئے ظالموں کا ساتھ دیا ہوتا ہے کہ اُن سے امیدیں وابستہ کی تھیں۔ یا اُن کے مواخذے اور پکڑ سے ڈرتے تھے چاہے جہل اور ناسمجھی کی بدولت اور یا پھر کسی اور غرض اور مرض کی وجہ سے، تو وہ قیامت کے دن اور اُس وقت جب الٰہی عذاب اور اپنے آپ سے اِن لیڈروں کی بے تعلقی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے؛ اپنی غلطی سمجھ جائیں گے۔ افسوس کریں گے کہ وہ کیوں اللہ کے عذاب کو بھولے ہوئے تھے اور ظالم حکمرانوں کے اقتدار اور عذاب کے خوف سے اللہ کے دشمنوں کا ساتھ دیئے رکھا۔ اب وہ سمجھ جائیں گے کہ اقتدار کا اصل مالک اللہ ہے اور یہ بظاہر مقتدر حکمران اُس کے سامنے کس قدر بے اختیار اور ناتواں ہیں۔ وہ دیکھ لیں گے کہ جن سے اُن کو مدد کی امیدیں تھیں وہ خود اللہ کے عذابوں میں گرفتار ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اِن کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اُلٹا اِن سے بیزار ہیں۔ تو اُس وقت وہ خواہش کریں گے کہ کاش دوبارہ دنیا میں جانا نصیب ہو اور وہاں یہ بھی اُن سے بیزاری کا اعلان کر دیں۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ كُلُوا۟ مِمَّا فِى ٱلْأَرْضِ حَلَـٰلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا۟ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَـٰنِ ۚ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِٱلسُّوٓءِ وَٱلْفَحْشَآءِ وَأَن تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾

(۱۶۸)۔ اے لوگو! زمین پر موجود حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقش پا کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (۱۶۹)۔ یقیناً وہ تمہیں کراہت انگیز اور قبیح افعال پر اُبھارتا ہے اور اِس پر کہ اللہ کے بارے میں وہ کچھ کہہ ڈالو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

(۱۶۸۔۱۶۹)۔ یہاں چند اساسی ہدایات نظر آتی ہیں:

- زمین میں موجود وہ چیزیں کھاؤ جو حلال ہیں اور پاک بھی ہیں۔ نہ کہ حرام؛ یا ناپاک اور گندی چیزیں چاہے وہ بجائے خود حلال ہی ہوں۔
- حلال وحرام میں شیطان کی متابعت نہ کرو، وہ تمہارا دشمن ہے، وہی دشمن جس نے تمہارے پردادا آدم علیہ السلام کو ممنوع پھل کھانے پر اُکسایا تھا۔

- شیطان تمہیں کراہت انگیز اور قبیح افعال پر نیز حرام کھانے، حرام ذرائع سے مال کمانے، اور حرص و بخل پر اکساتا ہے۔ تمہارے دل میں اللہ کے بارے میں وہ باتیں کرنے کا شوق پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ جبکہ اللہ کے بارے میں تمہیں وہی کچھ کہنا چاہیے جو خود اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُواْ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُواْ بَلۡ نَتَّبِعُ مَآ أَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ ءَابَآءَنَآۚ أَوَلَوۡ كَانَ ءَابَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُونَ شَيۡـٔٗا وَلَا يَهۡتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ كَمَثَلِ ٱلَّذِي يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ إِلَّا دُعَآءٗ وَنِدَآءٗۚ صُمُّۢ بُكۡمٌ عُمۡيٞ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُونَ ﴿١٧١﴾

(۱۷۰)۔ اور جب اِنہیں کہا گیا: اُس چیز کی متابعت کرو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے، تو کہتے ہیں: نہیں! بلکہ ہم اُس چیز کی متابعت کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے، بھلا چاہے اِن کے باپ دادا نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی راہِ راست پر ہوں۔ (۱۷۱)۔ اور اُن لوگوں کو جو کافر ہوئے، پکارنے کی مثال ایسی ہے جیسے اُن کو پکارا جا رہا ہوں جو ہانک پکار کی صدا کے علاوہ کچھ نہیں سنتے، بہرے، گونگے اور اندھے؛ پس وہ سمجھیں گے تو نہیں۔

---

(۱۷۰)۔ شیطان کے وسوسوں سے متاثرہ افراد اللہ کے دین سے اپنے باپ دادا کے دین کو بہتر سمجھتے ہیں۔ قرآن کی متعدد آیات میں آپ دیکھیں گے کہ ہر پیغمبر کی دعوت کے مقابل مفسد اور منحرف مذہبی اور سیاسی رہنما، لوگوں سے کہتے رہے ہیں: اپنے باپ دادا کے دین پر جمے رہو، یہ تمہیں اپنے دین سے پھیرنا چاہتے ہیں، ہم نے تو ایسی باتیں پہلے نہیں سنیں، ایسی باتیں تو ہمارے باپ دادا سے چلتی نہیں آئیں۔

(۱۷۱)۔ اِن کافروں کو حق کی دعوت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی گڈریا یا چرواہا جانوروں کو ہانک رہا ہو اور وہ ہانک پکار کی صدا کے علاوہ اور کچھ نہیں سنتے۔ چرواہے کی آواز کا مفہوم نہیں جانتے، صرف ایک پکار سنتے ہیں۔ وہی حال اِن کا بھی ہے یہ نہ تو حق پرست داعیوں کی بات سنتے ہیں، نہ خود آگے بڑھ کر دوسروں سے جاننے کا داعیہ رکھتے ہیں اور نہ ہی اِن میں حق و باطل کے درمیان تفریق کی بصیرت ہوتی ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَـٰتِ مَا رَزَقْنَـٰكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحْمَ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِۦ لِغَيْرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنِ ٱضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾

(۱۷۲)۔ اے مومنو! اُس رزق میں سے پاکیزہ اور ستھری چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اُس کی بندگی کرتے ہو۔ (۱۷۳)۔ حق یہ ہے کہ تم پر حرام کی گئی ہیں، مردار گوشت، خون، سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو (اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کی گئی ہو) اور جو مجبور ہو جائے مگر باغی اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو اُس پر کوئی گناہ نہیں یقیناً اللہ مہربان معاف کرنے والا ہے۔

---

(۱۷۲)۔ اللہ کی بندگی کا تقاضا ہے کہ اُس کا عطا کردہ حلال اور پاکیزہ رزق کھایا جائے۔ حرام اور ناپاک سے پرہیز کی جائے اور اُس کا شکر بجالایا جائے۔ تمہیں اُس کی دی ہوئی نعمتوں سے اُسی طرح استفادہ کرنا چاہیے جس طرح اُس نے حکم دیا ہے۔ حرام اور ناجائز مقاصد کے حصول کے لئے اُس کے دیئے ہوئے رزق کو وسیلہ نہ بناؤ۔

(۱۷۳)۔ حلال اور حرام کا تعین تمہارا کام نہیں، اِس بارے میں اللہ نے خود فیصلہ فرمار کھا ہے۔ جس طرح حرام چیزوں کو حلال قرار دینا جرم ہے اِسی طرح تقویٰ کے نام پر حلال چیزوں کا حرام کرنا بھی گناہ ہے۔ مذکورہ بالا چیزیں اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کر رکھی ہیں مگر جو انتہائی مجبور ہو جائے، موت کو گلے لگانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ پائے، جب کہ اُس کے دل میں بغاوت کا جذبہ بھی نہ ہو اور ضروری حد سے تجاوز کرنے والا بھی نہ ہو تو ضرورت کے مطابق اِن میں سے کھا سکتا ہے۔ یعنی یہاں دو شرائط ذکر کی گئی ہیں: دل میں بغاوت کا جذبہ نہ ہو اور ضرورت سے (زیادہ) آگے بڑھ کر کھائے بھی نہ۔

جو جانور شرعی طریقے سے ذبح نہ کیا گیا ہو اُس کے گوشت کو مردار کہتے ہیں مثلاً کہیں کسی بلندی سے گر کر یا چوٹ کھا کر یا سانس گھٹ کر یا بیہوشی وغیرہ کی دوا کھا کر یا سر میں گولی کھا کر مر گیا ہو۔

اُس خون کا کھانا حرام ہے جو رگوں سے بہتا ہے۔ اِس میں وہ خون شامل نہیں ہے جو خون بہہ جانے کے بعد بھی گوشت کے اندر رہ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر یا کسی دوسرے کے اعترافِ بزرگی اور رضاء کے لئے جانور ذبح کرنا نہ صرف حرام ہے اور اِس سے اُس جانور کا گوشت حرام ہو جاتا ہے بلکہ یہ ایک گونہ ظلم بھی ہے۔ یہ حیوان تمہاری طرح زندہ ہے، درد

محسوس کرتا ہے، ماں باپ اور اولاد رکھتا ہے اگر اللہ اُس کے ذبح کرنے کی اجازت نہ دے تو ہم کسی بھی عقلی دلیل کی بنیاد پر اِس کے ذبح کے جائز ہونے کی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ اِسے اللہ نے پیدا کیا ہے اُس کی زندگی کے بارے میں اُس کے علاوہ کسی دوسرے کو فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ خاص حالات میں اللہ تعالیٰ نے اِس کو ذبح کرنے کی اجازت دی ہے لہٰذا ذبح کرتے وقت اِس پر صرف اللہ کا نام لیا جانا قابل فہم ہے اُس کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لیا جانا جائز نہیں۔ جانور کا گوشت نہ صرف اُس وقت حرام ہے جب ذبح کرتے وقت اُس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو بلکہ اُس وقت بھی حرام ہے کہ اُس پر نام تو اللہ ہی کا لیا گیا ہو مگر ذبح کسی دوسرے کی تعظیم کے لئے کیا گیا ہو۔ کسی بادشاہ، پیر، بت، قبر یا کسی بھی چیز یا شخص کی تعظیم اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ذبح کئے جانے والے جانور کا گوشت حرام ہے۔ مہمان کے لئے جانور ذبح کرنا جائز ہے مگر اُس صورت میں بھی اُس کے پیروں میں لٹا کر یا کسی کے بھی پیروں میں ذبیحہ کرنا حرام ہے۔ مسلم سے روایت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے:لعن الله من ذبح لغير الله: اُس پر اللہ کی لعنت ہو جو غیر اللہ کے خوشنودی اور تقرب کے لئے جانور ذبح کرتا ہے۔

اگر چہ یہاں خصوصی طور پر حرام گوشت کے بارے میں بحث کی گئی ہے، لیکن فقہا اور محقق مفسرین اِس پر متفق ہیں کہ اس (**ما اهل به لغيرالله**) میں وہ سب کچھ شامل ہے جو غیر اللہ کے نام پر وقف کر دیا گیا ہو۔ چاہے خوراک ہو، کپڑا ہو یا رقم وغیرہ۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكۡتُمُونَ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَيَشۡتَرُونَ بِهِۦ ثَمَنٗا قَلِيلًا ۙ أُوْلَٰٓئِكَ مَا يَأۡكُلُونَ فِي بُطُونِهِمۡ إِلَّا ٱلنَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡعَذَابَ بِٱلۡمَغۡفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصۡبَرَهُمۡ عَلَى ٱلنَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ نَزَّلَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ ۗ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ ٱخۡتَلَفُواْ فِي ٱلۡكِتَٰبِ لَفِي شِقَاقِۭ بَعِيدٖ ﴿١٧٦﴾

(۱۷۴)۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی نازل کردہ کتاب کو چھپاتے ہیں اور اُسے تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ دیتے ہیں تو یہ گروہ بجز آگ کے اور کچھ اپنے پیٹوں میں نہیں بھرتا اور قیامت کے دن اللہ نہ اِن سے بات کرے گا اور نہ اِن کو پاک کرے گا اور اِن کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ (۱۷۵)۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا، تو یہ کس

چیز نے اِن کو آگ کا عذاب سہنے کا حوصلہ دیا؟(۱۷۶)۔ یہ اِس سبب سے کہ اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے اور جنہوں نے اِس کتاب میں اختلاف کیا تو وہ اختلاف میں بہت دور نکل گئے (بہت گہری دلدل میں اُتر گئے ہیں)۔

(۱۷۴۔۱۷۶)۔ جس کسی نے اللہ کی کتاب (احکامات) کو بیان کرنے سے پہلو تہی کی اور کسی دنیوی فائدے کے حصول کے لئے اُس میں سے کچھ چھپایا۔ جس نے ظلم اور فساد کے خلاف آواز اُٹھانے سے گریز کیا، جہل اور شرک سے لوگوں کو نجات دلانے کی خاطر جہاد برپا نہ کیا۔ اُس کے اِس طرز عمل کو اختیار کرنے کی وجہ چاہے اپنے مال ومتاع کو ممکنہ خطرات سے بچانا ہو یا یہ لالچ کہ یوں کتمان حق کر کے وہ وقت کے ظالم حکمرانوں سے مراعات حاصل کرلے گا۔ تو جس طرح اُس نے جان بوجھ کر اللہ کی کتاب پر اپنا منہ بند کر رکھا تھا اُسی طرح قیامت کے دن اللہ اُس سے بات نہیں کرے گا اور اُس کو گناہ سے پاک نہیں کرے گا ٹھیک اُسی طرح جس طرح اُس نے معاشرے کو ظلم اور شرک کے فساد سے مقابلہ کرکے اُسے پاک نہیں کیا تھا۔ جس طرح اُس نے دنیا میں مظلوموں کو عذاب میں بے یار و مددگار چھوڑ رکھا تھا اُسی طرح قیامت کے دن اللہ اُسے دردناک عذاب میں مبتلا کرکے چھوڑے گا۔ سکوت و مداہنت کی پالیسی سے جو کچھ یہ حاصل کر رہے ہیں اور جو کچھ یہ اپنے معدے میں اُنڈیل رہے ہیں وہ دوزخ کی آگ ہے۔ اِنہوں نے ہدایت کی جگہ ضلالت کا انتخاب کر رکھا ہے اور مغفرت کی جگہ عذاب الٰہی کا۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ اِن کا ہر اختلاف حق اور حقیقت سے اختلاف ہے۔

۞ لَّيْسَ ٱلْبِرَّ أَن تُوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ قِبَلَ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ وَلَـٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ وَٱلْكِتَـٰبِ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَـٰهَدُوا۟ ۖ وَٱلصَّـٰبِرِينَ فِى ٱلْبَأْسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلْبَأْسِ ۗ أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ ۖ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾

(۱۷۷)۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ آپ اپنا رُخ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیں، بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ، روزِ آخرت، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لے آئیں اور جنہوں نے باوجود مال کے ساتھ محبت کے اِسے خرچ کیا؛ اپنے رشتہ داروں،

یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور ہاتھ پھیلانے والوں پر اور محکوموں کی آزادی کے لئے، نماز ادا کی، زکوٰۃ ادا کی اور وہ جو عہد باندھ لینے کی صورت میں وعدوں کا پاس رکھنے والے ہیں، مشکلات، نقصانات اور لڑائی کے دوران صبر کرنے والے، یہی لوگ (اپنے دین اور ایمان کے دعوے میں) سچے اور صادق ہیں اور یہی متقی ہیں۔

(۱۷۷)۔ یہ ہے صدق اور تقویٰ کا حقیقی معیار اور یہی ہیں ایک صادق اور متقی کی صفات، جو اِس آیت میں واضح کی گئی ہیں۔ صادق اور متقی وہی شخص ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں، ایسا نہ ہونے پائے کہ کچھ اور صفات کی بدولت کسی کو صادق اور متقی قرار دو۔ مبادا کہیں یہ بات ذہن میں آجائے کہ اِس کے علاوہ بھی صدق و تقویٰ کے مقام پر پہنچنے کا کوئی راستہ موجود ہے۔ کہیں اُن لوگوں کو اِس کا مصداق نہ سمجھ بیٹھو جو قبلے کی سمت کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں، مشرق اور مغرب کی طرف رُخ کرنا اصل اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں اور فروعی مسائل پر اُن کی تاکید تو حیران کُن ہوتی ہے مگر نہ اللہ کی راہ میں جہاد پر کمربستہ نظر آتے ہیں، نہ اللہ کی راہ میں سر و مال قربان کرنے یا کوئی اور قربانی دینے پر تیار ہیں، نہ اُنہوں نے دین کی خاطر مشکلات اور تکالیف برداشت کی ہیں اور نہ ہی جہاد کے مورچوں میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ناسمجھ ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایسے اساسی مسائل کو اہمیت دینے اور اِن کی بنیاد پر فیصلے کرنے کے بجائے فروعی اور ثانوی مسائل کی طرف توجہ کرتے ہیں، خبردار تم اُن کی مانند نہ ہو جانا۔

اِس آیتِ مبارکہ میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی انفاق کا ذکر آیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کے حقوق موجود ہیں۔ متعدد احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، بلکہ احادیث میں تو اِس بارے میں اتنی تاکید ملتی ہے کہ انسان کو ہر اُس چیز کے انفاق اور ضرورت مند کو دے دینے کا مکلف کرتی ہیں جو اُس کی اپنی ضرورت سے زیادہ ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى ۖ ٱلْحُرُّ بِٱلْحُرِّ وَٱلْعَبْدُ بِٱلْعَبْدِ وَٱلْأُنثَىٰ بِٱلْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِىَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَىْءٌ فَٱتِّبَاعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ وَأَدَآءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَٰنٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى ٱلْقِصَاصِ حَيَوٰةٌ يَٰٓأُو۟لِى ٱلْأَلْبَٰبِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾

(۱۷۸)۔ اے ایمان والو! قصاص تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے، آزاد (قاتل) ہے تو (وہی) آزاد، غلام ہے تو غلام اور عورت ہے تو عورت، ہاں (ایک صورت استثنا کی بھی ہے، وہ یہ کہ) اگر کسی کے لئے اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو معروف کی پیروی کی جائے اور مستحسن طریقے سے ادائیگی کی جائے۔ یہ (تمہارے لئے) تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، لہٰذا اِس کے بعد اگر کسی نے زیادتی کی تو اُس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱۷۹)۔ اور اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے، اِس لئے کہ بچ کر رہو۔

---

(۱۷۸)۔ قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے، قاتل کے لئے اِسے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ صرف قاتل قتل کیا جائے گا چاہے وہ آزاد ہے تو وہی آزاد، غلام ہے تو وہی غلام اور عورت ہے تو وہی عورت، قاتل کے بدلے کوئی دوسرا قتل نہیں کیا جائے گا، ایسا نہ ہو کہ قاتل کے رشتہ داروں سے بدلہ لے لیا جائے۔ قصاص کا فیصلہ اسلامی حکومت کا قاضی کرے گا ایسا نہ ہو کہ مقتول کے ورثاء اپنے طور پر کارروائی کر بیٹھیں۔ دوسری طرف حکومت کو مکلف کیا گیا ہے کہ عدالت کا حکم نافذ کرے گی، مقتول کے ورثاء کے لئے قاتل سے قصاص لینے کے لوازم پورے اور مہیا کرے گی تا کہ وہ قاتل سے قصاص لے سکیں۔

قرآن نے زمانہ جاہلیت کے وہ تمام ناجائز اور ظالمانہ رسم ورواج ختم کر دیئے جو قصاص اور انتقام لینے کے حوالے سے رائج تھے۔ اُنہوں نے لوگوں کو معزز اور ذلیل، شریف اور رذیل اور حُر اور عبد جیسے فرقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ قتل مقاتلے کے معاملات میں بھی اُن کی یہ ناجائز فرقہ بندی ایک مسلمہ حیثیت کی حامل تھی اور اِس کی بھرپور رعایت کی جاتی تھی۔ کمزور کے قتل کے قصاص میں طاقتور، رذیل کے قتل کے قصاص میں شریف اور اِسی طرح غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام آیا تو لوگوں کے مابین مساوات جاری کر دی گئی، اعلان کیا گیا کہ: تمام انسان ایک اللہ کی مخلوق اور بندے ہیں، اُن کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑتا ہے، کوئی بھی کسی دوسرے پر بجز تقویٰ کے عطا کردہ فضیلت کے دوسری فضیلت نہیں رکھتا۔ بدلے اور انتقام کا نام بدل کر قصاص رکھ دیا گیا جس کا معنٰی برابری ہے اور اعلان کر دیا گیا کہ: (أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ: نفس کے بدلے نفس)۔ یہ انسانوں کے مابین برابری کا وہ اعلان تھا جس کے ہزار سال بعد بھی دنیا کے کسی ملک کے شہری قوانین میں اِس کا نمونہ موجود نہیں تھا بلکہ عملی طور پر تو اب بھی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اُن ممالک میں سے بھی جو بزعمِ خویش اپنے آپ کو بشری حقوق کے علمبردار قرار دیتے ہیں اور انسانوں کے درمیان برابری کا دعویٰ کرتے ہیں، کسی ایک نے بھی اِس اصول کی پاسداری نہیں کی ہے۔ امریکہ اپنے زیرِ تسلط اور زیرِ یلغار و فوج کشی علاقوں میں اپنے فوجیوں کو ہر جرم کی کھلم کھلا اجازت دیتا ہے۔ جنگی جرائم کے احتساب کے مذاکروں اور اقدامات میں اُن کے احتساب کی مخالفت کرتا ہے۔ باگرام، ابو غریب اور گوانتاناموبے کے جہنم زاروں میں نہتے اور بے کس

قیدیوں کے ساتھ جو کچھ اِنہوں نے کیا؛ وہی جن کی تصاویر تمام دنیا کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا پر پھیل گئیں، اِس کی ناقابل تردید دلیل فراہم کرتی ہیں کہ یہ بے رحم متمدن کافر ابھی اُس مقام سے کتنے دور ہیں جو اسلام نے احترام آدمیت، قصاص اور مساوات کے لئے متعین کر رکھا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ تمدن اور ترحم کے یہ جھوٹے، مکار اور ریاکار دعویدار قصاص کے بارے میں اسلامی قوانین پر معترض بھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ قاتل کے لئے قتل کی سزا دنیا کے تمام ممالک کے قوانین سے حذف ہونی چاہیے۔ دوسری طرف اسلام قصاص کا قانون جاری کر کے لوگوں کی زندگی محفوظ کرتا ہے، عدل کی ضمانت فراہم کرتا ہے، خونریزی کی روک تھام کرتا ہے اور ساتھ ہی قصاص کا اختیار مقتول کے ورثاء کو دے کر اور دیت کا قانون نافذ کر کے قاتل اور مقتول کے گھرانے کے درمیان صلح صفائی کا راستہ بھی کھولتا ہے۔ یہ بھی احتیاط روا رکھتا ہے کہ قاتل قصاص لینے کا مقتول کے ورثاء کا حق تسلیم کرے گا تو دیت کا فائدہ لے سکے گا اور مقتول کے ورثاء کو پابند کرتا ہے کہ قاتل ہی سے قصاص لیا جائے گا نہ کہ اُس کے رشتہ داروں سے۔ ایک کو ہدایت کی جاتی ہے کہ: اگر مقتول کے ورثاء قصاص پر اصرار چھوڑ کر دیت لینے پر رضامند ہو جائیں تو بہترین طریقے سے ادا کی جائے اور دوسرے فریق کو کہا جاتا ہے کہ دیت پر راضی ہونے کے بعد خوبصورتی کے ساتھ اُس کا مطالبہ کریں اور خبردار دیت وصول کرنے کے بعد کہیں بدلہ لینے کی کوشش نہ کر بیٹھنا۔

(۱۷۹)۔ قصاص کے ساتھ خونریزی کی روک تھام ہوتی ہے۔ لوگوں کی زندگیوں کو اُن قاتلوں کی طرف سے درپیش خطرات سے بچا لیا جاتا ہے جو قصاص کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہر بے کس پر ظلم و تعدی میں شیر ہو جاتے ہیں اور پورے معاشرے کے امن و امان کو خطرے سے دوچار کر دیتے ہیں۔ معاشرے میں حقیقی امن نہ تو پولیس کی تعداد بڑھانے سے اور نہ ہی پولیس کا حفاظتی اور جاسوسی نظام مضبوط کرنے سے آتا ہے۔ نہ ہی جیل خانوں کی تعمیر اور اُنہیں بھرنے کا اہتمام اِس کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اِن طریقوں سے فراہم کیا گیا امن ہمیشہ وقتی اور غیر حقیقی ہوتا ہے۔ امریکہ کے نیویارک کی طرح بڑے بڑے شہروں میں بھی، جہاں ہر قدم پر پولیس اور خفیہ محکموں کے اہلکار موجود ہوتے ہیں اور ہر طرف کیمرے نصب ہوتے ہیں؛ نہ تو کوئی شخص بدمعاشوں کے خوف سے جیب میں رقم لے کر نکل سکتا ہے اور نہ ہاتھ میں بریف کیس۔ اگر چند گھنٹوں کے لئے بھی بجلی چلی جاتی ہے تو اتنے جرائم واقع ہو جاتے ہیں جن کی تعداد ایشیا کے بڑے بڑے ممالک کے سالانہ جرائم سے زیادہ ہوتی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ٱلْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنۢ بَدَّلَهُۥ بَعْدَمَا سَمِعَهُۥ فَإِنَّمَآ إِثْمُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ

يُبَدِّلُونَهُۥٓ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

(۱۸۰)۔ جب تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ ترکہ چھوڑ رہا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے بارے میں معروف طریقے سے وصیّت اُس پر فرض کی گئی ہے، متقیوں پر یہ ایک لازمی حق ہے۔(۱۸۱)۔ اور جو اُسے سنے اور سننے کے بعد بدل ڈالے، تو اُس کا گناہ بدل ڈالنے والوں پر ہے۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا سننے والا ہے۔(۱۸۲)۔ اور اگر وصیّت کنندہ کے کسی گناہ یا ظلم میں پڑ جانے کے احتمال کے خوف سے سننے والا حق تلفی کی اصلاح کر بیٹھے تو گناہ کی بات نہیں ہے، یقیناً اللہ نہایت مہربان معاف کرنے والا ہے۔

(۱۸۰۔۱۸۲)۔ مالدار لوگوں پر مرنے سے قبل وصیّت کرنا لازم ہے، معروف طریقے سے۔ اگرچہ زکوٰۃ کی فرضیت اور ورثاء کے حقوق کے تعین کے بعد وصیّت کی ہدایت غیر ضروری اور غیر اہم لگتی ہے مگر اِس کے باجود ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں جن میں وصیت بہت سے تنازعات کو حل کر دیتی ہے۔ اِس کی بدولت میراث کے حصوں سے محروم نادار رشتہ داروں کی مشکلات حل کی جاسکتی ہیں اور وصی اپنے مال کے تیسرے حصے سے اِن مستحق نادار رشتہ داروں کی مناسب مدد کر سکتا ہے۔ مثلاً باپ کی زندگی میں اُس کا کوئی بیٹا وفات پا جاتا ہے اور اپنے پیچھے بیوہ اور اولاد چھوڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دادا کی میراث میں اُن کا متعین و معلوم حق نہیں ہے، ایسی صورت میں دادا اُن کے ساتھ اِس تیسرے حصے میں سے مدد کی وصیّت کر سکتا ہے۔ وصیّت میں دو شرائط رکھی گئی ہیں: پہلی یہ کہ جس رشتہ دار کے لئے اللہ نے خود میراث میں حصہ طے کر رکھا ہے اُس کے بارے میں وصیّت نہیں کی جاسکتی اور دوسری یہ کہ ترکہ کے تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیّت نہیں کی جاسکتی۔ اگر وصی خود اِن ضوابط کا خیال نہ رکھ سکے اور وصیّت کرنے میں کسی حقدار کے ساتھ زیادتی کر بیٹھے تو سننے والے کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اُس انحراف کو مناسب تبدیلی کر کے درست کر دے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

(۱۸۳)۔ اے ایمان والو! تم پر روزہ ایسے فرض کیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ دامن بچا سکو۔ (۱۸۴)۔ گنتی کے چند دن ہیں، لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو تو پھر باقی دنوں میں سے گنتی پوری کر لے۔ اور اُن لوگوں پر جو بمشکل (تکلیف کے ساتھ) روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کے (ایک دن کی) خوراک کا فدیہ مقرر کیا جاتا ہے، تو جو کوئی اپنی مرضی سے (مزید) بھلائی کا مظاہرہ کرے تو یہ اُس کے فائدے میں ہے اور اگر (رخصت کے باوجود) روزہ رکھ لے تو یہ (اور بھی) بہتر ہے اگر تم جانو۔

---

(۱۸۳)۔ روزہ گزشتہ اُمتوں پر بھی فرض تھا۔ اِس کا ہدف یہ ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ اور دامن بچانے کی عادت نشوونما پالے اور عزم اور ارادے کی مضبوطی نصیب ہو۔ جو کوئی مہینہ بھر حلال روزی سے دستکش رہے، نفس کے بار بار کے تقاضوں کے آگے سپر انداز نہ ہو تو اِس کے ساتھ اُس کے ارادے مضبوط اور عزائم پختہ ہو جاتے ہیں۔ یوں روزوں کے بعد بھی اُس کے لئے نفس کے ناجائز اور ناروا مطالبات کے آگے صبر و ثبات اختیار کرنا اور اپنا دامن بچانا آسان ہو جاتا ہے۔

پیغمبر علیہ السلام نے رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ قرار دیا ہے۔ یعنی یہ کہ روزہ تمہارے اندر صبر پیدا کرتا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصیام جنة فلا یرفث و لا یجھل: روزہ ڈھال ہے تو روزہ رکھنے والا نہ تو بے حیائی کے کام کرے اور نہ ہی جاہلانہ اعمال۔

مسافر کو سفر کے دوران روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے جس کے بدلے اُسے بعد میں روزہ رکھنا ہو گا۔ آدمی مسافر کب تصور کیا جائے گا؟ یعنی مسافر ہونے کے لئے سفر کی حد کیا ہے؛ اِس کا علم احادیث سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ احادیث کی رو سے تین دن میں طے ہونے والا فاصلہ سفر کی حد تصور کیا گیا ہے۔ یہ میل کے حساب سے ۴۸۔۵۰ میل اور کلومیٹر کے حساب سے ۷۸۔۷۴ کلومیٹر بنتا ہے۔

(۱۸۴)۔ اِس آیت کا ترجمہ اکثر مفسرین نے اِس طرح کیا ہے: اگر کوئی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو نہ رکھے مگر اُس پر فدیہ دینا لازم ہے۔ اِس ترجمے کی رو سے یہ آیت روزے کے بارے میں ابتدائی ہدایت ہے جو بعد والی آیت سے منسوخ ہو گئی ہے۔ شروع شروع میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا مسلمانوں کی مرضی پر چھوڑا گیا تھا جو روزہ نہیں رکھتے تھے فدیہ ادا کر دیا کرتے تھے۔ بعض دوسرے اِس کا ترجمہ اِس طرح کرتے ہیں جیسے ہم نے اُوپر کیا ہوا ہے۔ اِس صورت میں آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اُن ناتواں اور بوڑھوں سے بحث کرتی ہے جن کے لئے روزہ انتہائی مشکل ہے۔ وہ رخصت کا فائدہ اُٹھانا چاہیں تو روزے کے

بدلے ایک مسکین کو ایک دن کی خوراک دے سکتے ہیں اور اگر اِس سے زیادہ دے دیں تو یہ اُن کے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تکلیف کے باوجود روزہ رکھ لیں، یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو رخصت سے فائدہ اُٹھانے کی سہولت دے رکھی ہے تو یہ تو اور بھی بہتر صورت ہے۔ ذرا غور کریں، روزے کا فدیہ ایک آدمی کی ایک دن کی خوراک کی صورت میں مقرر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزے کا ایک ہدف مسلمانوں کو ناداروں کی مالی مدد کے لئے تیار کرنا بھی ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا۟ ٱلْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا۟ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾

(۱۸۵)۔ رمضان کا مہینہ وہی ہے جس میں قرآن نازل ہوا؛ لوگوں کے لئے رہنما، ہدایت کی واضح نشانیاں لئے ہوئے اور فرقان۔ تو جو کوئی اِس مہینے کو پائے؛ وہ روزہ رکھے، اور اگر کوئی بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں سے گنتی پوری کرے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور سختی کا ارادہ نہیں رکھتا؛ یہ اِس لئے کہ گنتی پوری کر لو اور اللہ کی تکبیر کرو (بڑائی بیان کرو) اِس بات پر کہ اُس نے تمہیں ہدایت بخشی اور اِس لئے کہ تم شکر گزار بنو۔

---

(۱۸۵)۔ اِس مہینے کا روزہ اِس لئے فرض کیا گیا کہ اِس میں قرآن نازل ہوا؛ لوگوں کے لئے رہنما کتاب، واضح ہدایات رکھنے والا، حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا یہ روشن چراغ نازل فرمایا گیا۔ اِس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے چاہیئے کہ اِس مہینے کے روزے رکھ لئے جائیں۔ اِس طرح آپ اللہ کی بزرگی اور عظمت کا اعتراف بھی کر پائیں گے اور اِس رمضان اور قرآن کے احترام کی بدولت اُمید ہے کہ ہدایت سے بھی بہرہ مند ہوں گے۔ یہ گمان نہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سختی کا ارادہ رکھتا ہے، نہیں؛ ایسا ہرگز نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ قرآن کی نعمت اور روزہ کی فرضیت اُس کی نوازش اور رحمت کی نشانیاں اور اسباب ہیں۔ سختیوں سے بچانے ہی کے لئے تو اُس نے یہ قرآن نازل فرمایا ہے اور نزولِ قرآن کے مہینے کے روزے فرض کئے ہیں۔

اِس آیت سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینے کے داخل ہونے کے ساتھ ہی دنیا کے تمام مسلمانوں پر روزہ رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب اِس مہینے کا چاند اپنے محاق (Interlunar) سے نکل آتا ہے، نظر چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں آجائے۔ محاق سے نکلنے اور کسی بھی جگہ اُس کے ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نیا مہینہ شروع ہوا اور ظاہر ہے جب وہ شروع ہوا تو روزہ سب پر فرض ہو چکا۔ اِس آیت کی رو سے مطالع (مقاماتِ رویت) کا اختلاف کوئی معنٰی نہیں رکھتا۔ ایسا قطعاً نہیں کہ ہر علاقے یا مملکت میں مہینہ اپنا الگ الگ ابتدا اور انتہا رکھتا ہے۔

مہینوں کے حساب کے لئے دو معروف تقویم رائج ہیں جن میں سے ایک سورج کے محور پر زمین کی گردش اور دوسری زمین کے محور پر چاند کے گردش سے مربوط ہے۔ شمسی تقویم یہ ہے کہ: زمین سورج کے محور پر تین سو پینسٹھ دن اور چھ سے کچھ زیادہ گھنٹوں میں اپنا چکر پورا کر لیتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اِس عرصے کو ایک سال کا نام دے کر اُسے اپنی ایک خواہش اور اندازے سے بارہ مہینوں پر تقسیم کر دیا جن میں سے کچھ تیس اور کچھ اکتیس دنوں کے قرار دیئے گئے ہیں۔ جبکہ چاند کچھ اوپر اُنیتس دنوں میں زمین کے محور پر اپنی گردش پوری کر لیتا ہے یہ ایک متعین اور معلوم عرصہ ہے جو ایک واقعہ (cosmic event) سے شروع ہو کر ایک واقعہ پر ختم ہوتا ہے۔ اگر کوئی خواہش کرے کہ سارے سال کے قمری مہینے آخری حد تک درست اندازہ لگا کر پہلے ہی سے متعین کرے (کہ کونسے مہینے کا چاند کس منٹ یا سیکنڈ طلوع ہوگا) تو علمی کسوٹی پر تول کر اِس طرح کرنا کوئی مشکل نہیں۔ یعنی حساب لگا کر بھی بتایا جا سکتا ہے کہ چاند کب اپنا ماہانہ مدار مکمل کرے گا۔ کب، کہاں، کس منٹ اور کس سیکنڈ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور کب، کہاں اور کس منٹ اور سیکنڈ دوبارہ ظاہر ہو کر اپنے نئے ماہ کے نئے سفر کا آغاز کرے گا۔ یہ جو اسلام نے مہینے کی ابتداء اور انتہا کو رویتِ ہلال سے مربوط کیا ہے؛ ایک بڑا دقیق علمی موقف ہے۔ اِس لئے کہ چاند کے دکھائی دینے سے یہ بات یقین کی انتہائی حد تک ثابت ہو جاتی ہے کہ نئے مہینے کا آغاز ہو گیا۔ جو لوگ ایک مرتبہ دیکھے جانے (رویت ہو جانے) کے بعد بھی کسی دوسرے مقام پر علیٰحدہ سے مستقل کسی دوسری رویت کا انتظار کرتے ہیں؛ انتہائی بے وقوف اور دین اور علم سے بے خبر ہیں۔ آج کل اِن تمام ترقی یافتہ وسائل کی مدد سے تو چاند کے محاق سے نکلنے، گزشتہ مہینہ مکمل کرنے اور نئے کی ابتداء کرنے کا وہ باریک لمحہ اور علاقہ بھی انتہائی درستگی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک اہم علمی بات ہے کہ رویت کے لئے ایک ہی متقی آدمی کی شہادت بھی کافی قرار دی گئی ہے۔ دشمن کی طرف سے اُمت میں اختلافات پیدا کرنے پر مامور کئے گئے ایجنٹوں اور احمق دوستوں نے اِن انتہائی غیر متنازع حقائق کو بھی اختلاف کا موضوع بنا دیا ہے۔ شیعہ اور بریلوی حضرات سعودیوں اور سلفیوں کے ساتھ سیاسی اور مذہبی اختلاف کی وجہ سے روزہ اور عید کا اعلان ایک ایک بلکہ دو دو دن کے تاخیر سے کر لیتے ہیں۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ ٱلدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا۟ لِى وَلْيُؤْمِنُوا۟ بِى لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

(۱۸۶)۔ اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، تو میں یقیناً قریب ہوں۔ جب دعا مانگنے والے مجھے پکارتے ہیں تو میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں پس وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ رشد و کمال حاصل کریں۔

---

(۱۸۶)۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ مدعا بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تمہارے قریب ہے، بہت قریب، رگِ جاں (شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب۔ جہاں تم دو آپس میں بیٹھے ہوتے ہو تو اللہ تم میں سے تیسرا ہوتا ہے اور اگر تین ہوں تو چوتھا اللہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے، تمہاری دعائیں سنتا ہے اور اُنہیں قبول کرتا ہے۔ اللہ نہ تو تم سے دور ہے اور نہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں، مقامات اور حجابات حائل ہیں۔ تمہیں اللہ کے پاس حاضر ہونے اور اپنی دعائیں پیش کرنے کے لئے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنی معروضات اپنے رب کے سامنے روبرو پیش کرسکتے ہو اور اطمینان رکھو کہ اللہ خود براہ راست اُنہیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اِس سے اُن مشرکانہ عقائد کی بیخ کنی ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے دعائیں سننے اور قبول کرنے میں شرک کی آمیزش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: تمہاری دعائیں اور عبادات صرف اُس صورت میں اللہ تک پہنچتی اور قبول ہوتی ہیں جب اُس کے مقربین کے وساطت سے پیش کی جائیں اور وہ اُن کی قبولیت کی سفارش کریں۔

اب جبکہ اللہ تمہارے قریب ہے تو تمہارے دعا مانگنے کے طریقے میں بھی اِس یقین کا اظہار ہونا چاہیے۔ مثلاً چیخ چیخ کر دعائیں مانگنا اِس یقین کے خلاف طرزِ عمل ہے اِس لئے کہ اِس طرح تو اُس سے مانگا جاتا ہے جو دور ہو۔ دعا مانگنے کے اپنے آداب ہیں اور چیخ چیخ کر مانگنا اُن کے خلاف عمل ہے۔ اِس بات کو روزے کے بیان میں زیرِ بحث لانے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں انسان اپنے رب کے اور اُس کی دعائیں اجابت کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ ٱلصِّيَامِ ٱلرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَٱلْـَٰٔنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَٱبْتَغُوا۟ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ

ٱلۡفَجۡرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيۡلِ ۚ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمۡ عَٰكِفُونَ فِي ٱلۡمَسَٰجِدِ ۗ تِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقۡرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

(۱۸۷)۔ روزوں میں اپنے بیگمات کے ساتھ رات کے وقت قربت تمہارے لئے حلال قرار دی گئی ہے۔ وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم اُن کے لئے۔ اللہ جان گیا ہے کہ تم اپنے ساتھ خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے تو اُس نے تم پر (رحمت کی) نظر کی اور معاف کر دیا۔ پس اب اُن کے ساتھ مباشرت کی اجازت ہے اور اُس عطا کی خواہش کرو جو اللہ نے تمہارے مقدر میں رکھ دیا ہے (یعنی اولاد کی خواہش میں قربت کرو) اور کھاؤ پیؤ تا آنکہ صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کر لو اور مسجدوں میں اعتکاف کے دوران مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی حدود ہیں اِن کے قریب نہ پھٹکو۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تا کہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

---

(۱۸۷)۔ مسلمان گمان کر رہے تھے کہ روزوں کے دوران رات کو سونے کے بعد اُٹھ کر اپنی بیویوں کے قریب ہونا تقویٰ کے منافی ہو گا اور اِس سے اجتناب بہتر ہو گا۔ اگر چہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ روکے گئے تھے لیکن درست یہ ہے کہ تا حال اِس بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اِس لئے کہ اِس کی حرمت کا ذکر نہ تو قرآن میں موجود ہے اور نہ ہی احادیث میں کہیں آیا ہے بلکہ وہ خود سے ایسا گمان کیے ہوئے تھے۔ پس جب وہ کبھی کبھار اپنے اِس گمان کے برعکس عمل کر بیٹھتے تھے تو گناہ اور خیانت کا احساس اُنہیں گھیر لیتا تھا۔ اِن حالات میں اللہ نے صریح الفاظ میں اجازت دے دی اور فرمایا کہ بیوی شوہر کے لئے اور شوہر بیوی کے لئے گناہوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے بالکل اُسی طرح جس طرح لباس گرمی اور سردی سے انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور بات چھیڑ دی تو ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ مباشرت کی غرض و غایت اولاد کی نعمت ہونی چاہئے نہ کہ فقط جنسی جذبات کی آسودگی۔ یہ وضاحت بھی اِسی جگہ کی گئی کہ روزے کا وقت اُفق پر صبح کی سفید دھاری کے طلوع سے لے کر رات کی ابتداء تک ہے اور رات سورج کے غروب ہونے سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کی ایک مبارک حدیث کا مفہوم ہے کہ "جب تک میری اُمت افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرے گی، اُن سے خیر کی توقعات وابستہ رہیں گی"۔ اِس لئے کہ یہ طرزِ عمل اِس بات کی نشانی ہے کہ وہ غیر ضروری اور بے جا تقویٰ داری کی ذہنیت کے زیر اثر دین میں کوئی چیز بڑھانے کے مرتکب نہیں ہو رہے ہوں گے۔ اُمتوں کا انحراف عموماً اِسی طرح شروع ہوتا ہے کہ اُن کے علماء اور مذہبی پیشوا اپنی طرف سے دین میں اضافے کر بیٹھتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں لوگوں کے بوجھ بڑھا دیتے اور اُن کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں اور بیڑیاں ڈال دیتے ہیں۔ قرآن کی رو سے ہر

پیغمبر کی ایک بڑی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کے کندھوں سے یہ بھاری بوجھ اُتار دے اور یہ زنجیریں توڑ ڈالے۔ پیغمبر علیہ السلام سورج کے غروب ہونے کے فوراً بعد روزہ افطار کر لیا کرتے تھے۔

اِس آیتِ مبارکہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی حدود پار کرنے کے خطرے سے بچنے کا دقتِ نظر سے اہتمام رکھیں اور حدود اللہ کی آخری حد تک قدم بڑھانے سے اجتناب کریں۔ اس لئے کہ اُس آخری حد پر پہنچ کر اِس بات کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ ذرا سا پیر پھسل جائے اور آدمی حد پار کر بیٹھے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُواْ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾

(۱۸۸)۔ اور آپس میں ناحق ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ، نہ ہی اربابِ اختیار کو (اپنے مال) بطورِ رشوت پیش کرو تا کہ اُن کے بل بوتے پر لوگوں کے مال میں ناجائز تصرف کر سکو، ایسے حال میں کہ تم جانتے ہو۔

(۱۸۸)۔ ناجائز معاملات سے اپنا دامن بچاؤ اور ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ۔ حکمرانوں کو رشوتیں دے دے کر اِس کی بدولت دوسروں کا مال ناجائز طور پر غصب نہ کرو جبکہ تم خوب جانتے بھی ہو کہ پرایا مال ہے اور تمہارے لئے اِس کا غصب کرنا حرام ہے۔

روزے کی بحث میں اِس ذکر کا چھیڑا جانا اِس بات کا غماز ہے کہ روزہ دراصل حرام سے اجتناب اور حلال رزق پر اکتفاء کی تربیت کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ جو کوئی اللہ کا حکم بجالاتے ہوئے حلال رزق سے کنارہ کش ہو سکتا ہے وہ کس طرح حرام کی طرف ہاتھ بڑھائے گا اور پھر ناحق دوسروں کا مال بٹورنے کے لئے حکام کو رشوت بھی پیش کرے گا؟؟

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِىَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَٱلْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ ٱلْبِرُّ بِأَن تَأْتُواْ ٱلْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ وَأْتُواْ ٱلْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَٰبِهَا ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٨٩﴾

(۱۸۹)۔ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں۔ اُنہیں کہو: یہ لوگوں کے لئے اوقات اور حج کے تعین کا ذریعہ ہے اور نیکی یہ نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں پچھواڑے سے داخل ہوؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ اپنا دامن بچا کر رکھو اور گھروں میں (بے شک) دروازوں سے داخل ہوؤ، اور اللہ سے ڈرو تا کہ فلاح پاؤ۔

---

(۱۸۹)۔ لوگ پیغمبر علیہ السلام سے قسم قسم کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور امید کرتے تھے کہ اُن کے ہر سوال کا جواب ملا کرے گا۔ چاند کے بارے میں بھی پوچھتے تھے کہ یہ کس طرح نکلتا ہے۔ ابتداء میں چھوٹا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ بڑا ہو جاتا ہے، پھر چھوٹا ہوتے ہوتے مہینے کے آخر میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہاں اُن کے جواب میں دو باتیں کہی گئی ہیں: اِسے اللہ تعالیٰ نے وقت کا حساب رکھنے کے لئے اِس طرح پیدا فرمایا ہے۔ وقت کے تعین کا یہ ایک ایسا آلہ ہے کہ ہر کوئی چاہے پڑھا ہوا ہو یا اَن پڑھ، اِس سے وقت کا تعین بھی کر سکتا ہے، مہینوں کا بھی اور سالوں کا بھی۔ اگر کبھی سردیوں کے ابتدائی مہینے میں روزے پڑتے تھے اور اِس سال دوبارہ اُنہی دنوں میں روزے آ گئے تو فوری سمجھ جاتا ہے کہ چھتیس سال گزر گئے۔ یوں وقت کا حساب کتاب کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ کہ چاند کی شکل وصورت میں تبدیلی کیونکر آتی ہے؛ قرآن کہتا ہے کہ: اِس وقت اِس کا سمجھنا تمہارے لئے مشکل ہے۔ اِس لئے کہ کسی چیز کا سمجھنا ایک مخصوص مرحلے، وقت اور طریقہ کار کا متقاضی ہوتا ہے۔ تھوڑا صبر سے کام لو اِس لئے کہ چیزوں کے سمجھنے کا طبیعی طریقہ اور مناسب راستہ مناسب وقت اور مرحلے کا انتظار ہے بالکل اُسی طرح جس طرح گھروں میں داخل ہونے کا ایک فطری اور درست طریقہ اور راستہ ہے۔ اور وہ ہے دروازہ، نہ کہ پچھواڑہ۔ اِس لئے گھروں میں دروازوں سے داخل ہوا کرو نہ کہ پچھواڑے سے دیواریں پھلانگتے ہوئے۔ چاند مختلف شکلیں کیوں اختیار کر لیتا ہے؛ کو درست طرح سے جان لینا سمجھ بوجھ کی ایک مخصوص حد اور مناسب وقت پر موقوف ہے۔ ابھی تمہارے اندر اِتنی صلاحیت نہیں ہے لہٰذا صبر سے کام لو اور اُس وقت کا انتظار کرو جب اِس کا سمجھنا تمہارے لئے ممکن ہو جائے۔ یہی بات ایک دوسری جگہ یوں فرمائی گئی ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَسۡـَٔلُواْ عَنۡ أَشۡيَآءَ إِن تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ وَإِن تَسۡـَٔلُواْ عَنۡهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلۡقُرۡءَانُ تُبۡدَ لَكُمۡ عَفَا ٱللَّهُ عَنۡهَاۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝١٠١ المائدہ ۱۰۱

اے ایمان والو! اُن چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔ اور اگر قرآن نازل ہونے کے دوران اِن کے بارے میں پوچھو گے تو بتا دی جائیں گی۔ اللہ اِس کے لئے تمہاری مغفرت کرے اور اللہ بُردبار درگزر کرنے والا ہے۔

تفاسیر میں یوں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ بعض عرب حج سے واپسی پر دروازے سے گھر میں داخل ہونے کے بجائے پچھواڑے سے دیوار پھلانگ کر یا پھر نیا دروازہ کھول کر داخل ہوا کرتے تھے۔ یہ اُن کے نزدیک تقویٰ کی ایک نشانی تھی۔ اِس آیت میں ایک طرف مومنوں کی رہنمائی کی گئی ہے کہ ہر کام اپنے معین و مقررہ طریقے سے انجام دیا جاتا ہے، عجلت نہ کریں، کسی بھی چیز کو سمجھنے کے لئے دروازے سے داخل ہوں، دیواریں نہ پھلانگو اور دوسری طرف سعادت اور فلاح کے بارے میں ایک جاہل قوم کے اندیشوں اور تصورات کی تعریف اور پہچان بھی کرا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ دین کو چند زوال پذیر قدروں اور صورتوں میں سموئے ہوئے ہوتے ہیں اور اُنہیں تقویٰ کا نام دے رکھا ہوتا ہے۔ اُنہی میں دنیوی سعادت اور اُخروی فلاح تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ دین کی روح سے غافل ہو کر دین کا اساسی پہلو پس پشت ڈال دیتے ہیں، اللہ کو بھول جاتے ہیں، شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، منافقت اور خیانت کی راہ پر چل نکلتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں لیکن اپنے اِن بڑے بڑے انحرافات سے قطع نظر فروعی مسائل پر سخت موقف اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں اور اُسی کو تقویٰ کا معیار سمجھتے ہیں۔ اِس سورت میں اِس بُری خصلت کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں: گائے کے رنگ، عمر اور کام کے بارے میں بنی اسرائیل کے سوالات، قبلے کے بارے میں اُن کے اعتراضات اور اب مدینے کے لوگوں کا یہ تصورِ دین کہ حج کے بعد دروازے کے راستے گھر میں داخلے کو خلاف تقویٰ سمجھتے ہیں۔ اِن سے کہا گیا ہے کہ بِر اور نیکی یہ نہیں ہے بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے اور حرام سے دامن بچایا جائے۔

وَقَٰتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يُقَٰتِلُونَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُعۡتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَٱقۡتُلُوهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوهُمۡ وَأَخۡرِجُوهُم مِّنۡ حَيۡثُ أَخۡرَجُوكُمۡۚ وَٱلۡفِتۡنَةُ أَشَدُّ مِنَ ٱلۡقَتۡلِۚ وَلَا تُقَٰتِلُوهُمۡ عِندَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَٰتِلُوكُمۡ فِيهِۖ فَإِن قَٰتَلُوكُمۡ فَٱقۡتُلُوهُمۡۗ كَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴿١٩٢﴾ وَقَٰتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٞ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ لِلَّهِۖ فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَلَا عُدۡوَٰنَ إِلَّا عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٩٣﴾

(۱۹۰)۔ اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں کے ساتھ لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، اور حد سے بڑھ جانے اور زیادتی کرنے سے مجتنب رہو۔ یقیناً اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۹۱) اور جہاں کہیں اُن کو پاؤ، قتل کر ڈالو اور وہاں سے اُن کو نکالو جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت (بڑا گناہ) ہے۔ اور مسجد حرام میں اُن سے نہ لڑو، جب تک وہ تم

سے نہ لڑیں، لیکن اگر لڑیں تو اُنہیں قتل کر ڈالو۔ کافروں کی یہی سزا ہے۔(۱۹۲)۔ لیکن اگر باز آجائیں تو اللہ مہربان در گزر کرنے والا ہے۔(۱۹۳) اور اُن کے ساتھ اُس وقت تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (تمام) اللہ کے لئے ہو جائے۔ لیکن اگر باز آجائیں تو پھر ظالموں کے علاوہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

(۱۹۰۔۱۹۲)۔ تمہیں اُن لوگوں کے ساتھ لڑنے کی اجازت دی گئی جو تم سے جنگ کرتے ہیں مگر جنگ میں بھی اسلام کے اُصولوں کا پاس رکھو۔ زیادتی اور حد سے گزرنے سے اجتناب کرو۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو اور درختوں اور فصلوں کو آگ نہ لگاؤ۔ دشمنوں کی لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، زخمیوں اور قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کرو، اپنے وعدوں سے نہ پھرو اور مسجدِ حرام اور حج و عمرے کے مہینوں کا احترام کرو۔ لیکن اگر وہ مسجدِ حرام یا حرام مہینوں میں لڑنا چاہیں تو پھر اُنہیں اُسی مقام اور اُنہی مہینوں میں بھی قتل کرنے کی اجازت ہے۔ فتنہ اور کفر کا تسلط قتل سے زیادہ قابلِ نفرت ہے، فتنہ ختم کرنے کے لئے تمہیں اِن کے قتل کی اجازت دی گئی ہے۔

(۱۹۳)۔ اِس مبارک آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ فتنہ سے مراد کفر کی حکمرانی اور اختیارات ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں جنگ کی غرض و غایت اور مقصد یہ ہے کہ فتنے اور کفر کی یہ حکمرانی اپنے اختتام کو پہنچ جائے اور تمام دنیا کا اقتدار کلی طور پر اللہ کے دین کے ہاتھوں میں آجائے۔

جس طرح اِس سے قبل ۱۷۷ ویں آیت کے تناظر میں کہا گیا ہے کہ مخالفین کے ساتھ فروعی و ثانوی اور بے فائدہ مناقشات کی جگہ اصلی اور بنیادی امور پر توجہ کرو۔ اور وہ اصلی اور بنیادی مسائل یہ ہیں کہ: اللہ اور روزِ آخرت پر، فرشتوں پر اور کتابوں اور انبیاء پر ایمان لایا جائے۔ اپنا محبوب مال اللہ کی راہ میں اور محتاجوں کی دستگیری کے لئے خرچ کیا جائے۔ نماز و ایتائے زکواۃ کی پابندی کی جائے، اپنے وعدوں کا پاس رکھا جائے اور جنگ کے محاذ پر اور مشکلات و مصائب پر صبر کیا جائے۔ یہاں بھی ایسے ہی ایک فرعی مسئلے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ: جاہلوں کو اُن کے حال پر رہنے دیں۔ اُنہیں چھوڑیں کہ اپنا مذہب رسموں (rituals) اور نیکیوں کے بارے اپنے غلط معیارات تک محدود رکھیں اور دیواریں پھلانگ کر گھروں میں آنے کو تقویٰ سمجھیں۔ آپ خود اساسی اور بڑے کاموں پر توجہ دیں اور وہ ہیں اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جنگ کرنا جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی راہ اپنائی ہوئی ہے اور تمہارے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔

ٱلشَّهۡرُ ٱلۡحَرَامُ بِٱلشَّهۡرِ ٱلۡحَرَامِ وَٱلۡحُرُمَٰتُ قِصَاصٌۚ فَمَنِ ٱعۡتَدَىٰ عَلَيۡكُمۡ فَٱعۡتَدُواْ عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا ٱعۡتَدَىٰ عَلَيۡكُمۡۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلۡمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾

(۱۹۴)۔ماہِ حرام (محترم مہینہ) کا بدل ماہِ حرام ہی ہے اور محرمات (محترم چیزوں کا احترام) باہم برابر ہیں۔ تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اُس پر ویسی ہی زیادتی کرو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے اور اللہ سے ڈرو اور خبر دار رہو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

(۱۹۴)۔ اگر دشمن شعائر اور مقدسات کا احترام نہ کرے اور حرام (محترم) مہینوں یا مسجد حرام میں تم پر ہاتھ اُٹھائے تو تم یک طرفہ طور پر اُن کے احترام کے مکلف نہیں ہو کہ مقابلے اور دفاع سے کنارہ کش رہو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ تمہیں جواب دینے کا پورا حق حاصل ہے، اُن کے ساتھ بالمثل معاملہ کرو اور اِس دوران ہر چیز سے زیادہ اللہ کے محاسبے کا دھیان رکھو۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرو جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بن سکتی ہو۔ اگر تم تقویٰ پر قائم رہے تو اللہ کی مدد اور استعانت تمہارے شاملِ حال رہے گی۔ یہاں بھی ملاحظہ کریں کہ قرآن راہِ خدا کے مجاہدین کو تقویٰ کی تاکید کرتا ہے، تقویٰ ہی کو مخلص اور متقی مجاہدین کی ایک خصوصیت اور انفرادیت قرار دیتا ہے اور اُسے جہاد کے ساتھ خصوصی طور پر مربوط ایک خصلت گردانتا ہے۔ یعنی اصل تقویٰ یہی ہے نہ کہ وہ جسے کچھ لوگ اوراد و وظائف کے ساتھ مربوط سمجھتے ہیں۔

وَأَنفِقُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا تُلۡقُواْ بِأَيۡدِيكُمۡ إِلَى ٱلتَّهۡلُكَةِۛ وَأَحۡسِنُوٓاْۛ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿١٩٥﴾

(۱۹۵)۔ اور اللہ کی راہ میں انفاق کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو؛ بے شک اللہ محسنین کو پسند کرتا ہے۔

(۱۹۵)۔ اللہ کی راہ میں مال و جان کی قربانی سے دریغ نہ کرو اِس لئے کہ اِس قِسم کی قربانی کے عدم وجود کی وجہ سے تباہی سے دوچار ہو جاؤ گے۔ اپنے ہاتھوں اِس تباہی کو آواز نہ دو، جہاد اور اللہ کی راہ میں قربانی سے دریغ تباہی اور ہلاکت کا باعث اور دشمن کے ہاتھوں تذلیل و تحقیر پر منتج ہوتا ہے۔ کسی بھی وجہ اور عذر کی بنیاد پر اِس سے پہلو تہی نہ کرو۔ تعجب ہے کہ بعض منحرف اور راہِ

راست سے بھٹکے ہوئے لوگ اِس واضح آیت کو بھی پتہ نہیں کس طرح توڑ مروڑ کر اِس سے یہ مطلب نکال لیتے ہیں کہ طاقتور دشمن کے ساتھ مقابلہ، خطرات میں کود پڑنا اور کم تعداد اور وسائل کے بل بوتے پر زیادہ مسلح اور کثیر التعداد دشمن سے لڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور قرآن کی رو سے حرام ہے یا پھر یہ کہ شہادت طلبانہ اقدامات ناجائز ہیں۔ یہاں پر عدم انفاق اور قربانی سے پہلو تہی کرنا باعث ہلاکت قرار دیا جارہا ہے۔ اِس سے یہ مراد لینا کہ طاقتور اور کثیر الاسباب دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور یا پھر یہ کہ شہادت طلبانہ اقدامات ناجائز ہیں؛ انتہائی غلط اور شرمناک استدلال ہے۔ یہ ایمان تو کیا عقل و فہم کے بھی خلاف ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو قرآن ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابلے پر تیار نہ کررہا ہوتا، نہ مسلمانوں کی ترغیب کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے تنِ تنہا نمرودیوں کے معبد میں گھس کر اُن کے بتوں کے توڑنے کا واقعہ بیان کرتا اور نہ ہی یہ کہہ رہا ہوتا کہ :كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةٍ كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ وَ اللهُ مَعَ الْصَابِرِيْن-اللہ کے حکم سے کتنے ہی قلیل گروہ (ایسے ہیں جو) کثیر گروہوں پر غالب آتے رہے ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ بے صبری کا شکار ہو کر خودکُشی کا ارتکاب کرنا اور اللہ کی شدید محبت سے مغلوب ہو کر شہادت طلبانہ اقدامات پر عمل کر گزرنا ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ اِن میں سے ایک یاس اور اللہ سے نااُمیدی کے عالم میں اِس اقدام کا ارتکاب کرتا ہے جبکہ دوسرا اللہ اور آخرت پر غیر متزلزل یقین کے زیرِ اثر اور اللہ کے دین کے دفاع کے لئے جان کی قربانی کے جذبے سے یہ کام کر گزرتا ہے۔ جب بھی ایک آدمی دس کے مقابلے میں نکلتا ہے در حقیقت خودکُش اقدام ہی کرتا ہے۔ اِس آدمی کے اور اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر دشمن کے صفوں کے اندر کسی اہم مقام تک پہنچنے والے اور ایک ایسی ضرب پہنچانے والے، جو کسی دوسرے طریقے سے پہنچانا ممکن نہ ہو، کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اِس سے پہلے والی آیت میں کہا گیا ہے کہ جو کوئی تمہارے خلاف زیادتی کرے تو تم بھی اُسے بالمثل جواب دو (فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ)۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد والی اِس آیت میں انفاق سے مراد، دشمن کے خلاف جہاد میں مال خرچ کرنا ہے۔ اگر یہ دونوں آیات ساتھ ساتھ اور ایک ہی مضمون کے دو متصل بیانات سمجھ کر زیرِ غور لائی جائیں تو اِن سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ یہاں پر انفاق سے مراد دشمن کے خلاف جہاد میں مال خرچ کرنا ہے۔ یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ جہاد کے سامان اور وسائل مہیا کرنے کے لئے مال خرچ نہ کرنے کا انجام خطرناک اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ دشمن کے ساتھ بالمثل معاملہ (ہونا چاہیے) جائز ہے۔

اِس آیت سے یہ تنبیہہ مراد لینا کہ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالو، قطعاً غلط ہے۔ یہ کوئی درست طرزِ عمل نہیں ہے کہ کسی کلام کا آدھا حصہ لے کر اُسے اپنے اگلے پچھلے حصوں سے کاٹ کر پیش کیا جائے اور پھر اُس سے خاص معنی اخذ کئے جائیں۔ اِس آیت سے استناد کرتے ہوئے یہ معنی نکالنا کہ شہادت طلبانہ (خود کش) اقدامات جائز نہیں ہیں نہ صرف بے بنیاد اور غلط استناد ہے بلکہ آیت کا بالکل ہی معکوس معنٰی اور انتباہ اخذ کرنا ہے۔

شہادت طلبانہ (خود کش) اقدامات کے بارے میں بحث و مباحثہ اُس وقت شدت سے منظر عام پر آیا جب نیویارک اور واشنگٹن میں ایسے ہی خود کُش حملے ہوگئے۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع جنگ کا آغاز کیا اور باقی دنیا کے تمام ممالک سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ اُن کے زیرِ کمان اِس جنگ میں اُن کا ساتھ دیں؛ نہیں تو وہ دہشت گردوں کے ساتھی قرار دے کر بلیک لسٹ کر دیئے جائیں گے۔ اِن ممالک کے بے ہمت اور بے حمّیت حکمرانوں نے نہ صرف امریکیوں کے مطالبے کے آگے سر جھکا دیا بلکہ اُن کے خلاف کئے گئے اقدامات کی سرکاری مفتیوں سے مذمت بھی کروائی اور اُن کے غیر اسلامی ہونے کے فتوے بھی جاری کروائے۔ اِس بارے میں مندرجہ ذیل باتیں قابلِ توجہ ہیں:

- شہادت طلبانہ اقدامات کے یہ مخالفین اِس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ قرآن دشمن کے ساتھ بالمثل معاملہ جائز رکھتا ہے۔ ایک مضطر انسان کے لئے تو قرآن حرام کو بھی جائز ٹھہراتا ہے اور مجبور کے لئے کلمۂ کفر تک کو روا قرار دے دیتا ہے۔ قرآن کی رو سے تو مظلوم کی بدزبانی اور گالیاں تک ناقابلِ مواخذہ ہیں، اُس کی مظلومیت کے پیشِ نظر اُس کے اقدامات کے ناجائز اور ناروا ہوتے ہوئے بھی اُن کی معافی کا اعلان کرتا ہے۔ جو لوگ اسرائیل اور امریکہ کے خلاف خود کُش اقدامات کرتے ہیں وہ ایک طرف مظلوم ہیں تو دوسری طرف ظلم سے نجات کا دوسرا ہر دروازہ بند بھی پاتے ہیں اور تیسری طرف عملِ بالمثل سے زیادہ کسی چیز کا نہ صرف یہ کہ ارتکاب بھی نہیں کرتے بلکہ اِسی کے لئے بالآخر مجبور بھی کئے گئے ہوتے ہیں۔
- جو لوگ امریکیوں کے خلاف شہادت طلبانہ اقدامات ناجائز سمجھتے ہیں، وہ وہی لوگ ہیں جو عراق اور افغانستان میں امریکیوں کے خلاف مجاہدین کے کئے جانے والے دوسرے اقدامات کی بھی تائید نہیں کرتے۔ یہ سرکاری مفتی ہیں، وہی کہتے ہیں جو اِن کی حکومتیں کہتی ہیں، وہی فتوے دیتے ہیں جو اِن کی حکومتیں لکھ کر اِن کے حوالے کرتی ہیں اور اُن پر مہر تصدیق لگانے کا حکم دے دیتی ہیں۔ ایک مفتی کا ضمیر اگر یہ گوارا کر لیتا ہے کہ مصر کی حکومت کی ایما پر فرانس میں حجاب کی ممنوعیت کو فرانس کا داخلی معاملہ قرار دے تو وہ امریکہ کے خلاف شہادت طلبانہ

اقدامات کا کس طرح ساتھ دے سکتا ہے۔ وہ کس طرح اِس کے جواز کا فتویٰ جاری کر سکے گا؟؟ جو کوئی پوری زندگی میں ایک لمحہ بھی اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نہ نکلا ہو، نہ کبھی اسلحہ اُٹھایا ہو، نہ کبھی مورچے میں بیٹھنا گوارا کیا ہو، نہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہوں، اور نہ ہی کبھی ظالم حکمرانوں کے خلاف حق کی کوئی ایک بات کی ہو۔ اُس سے کس طرح امید رکھتے ہو کہ وہ شہادت طلبانہ اقدامات کا ساتھ دے گا؟ جہاد کے فتوے کسی مجاہد عالم اور مجاہد مفتی سے لینے چاہئیں نہ کہ کسی قاعد سرکاری اور جہاد مخالف مفتی سے۔

- اگر کوئی شہادت طلبانہ اقدامات کا موازنہ اُس خودکشی سے کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نااُمیدی اور یاس کے نتیجے میں انجام پاتی ہے تو یہ تو بہت ہی نامناسب موازنہ ہو گا۔ قرآن کی اُن آیات، جو خوف و دہشت کے باعث خودکُشی کی ممانعت کرتی ہیں، کی تطبیق شہادت طلبانہ اقدامات پر کرنا تو انتہائی ناجائز تطبیق ہو گی۔ یہ تو خوف و دہشت نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ شدید محبت کی وجہ سے اور اُس کے دین پر غیرت کھا کر اپنی جان قربان کرنا ہے۔

سمجھ نہیں آتی کہ ایک آدمی اپنے اسلحہ کی پیٹی اور دستی بیگ میں بم، کارتوس اور راکٹ کے گولے بھر کر ایک ایسے دشمن کے مقابلے پر نکلتا ہے جس کے وسائل اُس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھی ہیں اور ترقی یافتہ بھی۔ دشمن سے مقابلہ ہونے کی صورت میں قوی امکان یہی ہے کہ وہ شہادت کو گلے لگا لے گا لیکن موت کے اِس یقینی احتمال کے باوجود وہ مورچے میں پہنچتا ہے۔ ڈٹ کر لڑتا ہے اور بالآخر شہادت سے سرفراز ہو جاتا ہے۔ اب اِس شخص میں اور اُس آدمی میں کیا فرق ہے جو یہی بم اپنے جسم کے ساتھ باندھ کر دشمن کی صفوں کے اندر گھستا ہے اور وہاں پہنچ کر اِن بموں کو (Detonate) کر کے دشمن کو اُڑا دیتا ہے اور یہ سب کچھ وہ مجبوراً بھی کر رہا ہوتا ہے یعنی اُس کے پاس اِس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ اِس لئے کہ کھلے میدان میں اسلحہ لے کر دشمن کے قریب تک پہنچنا ہی ممکن نہیں چہ جائیکہ اُسے کوئی نقصان پہنچایا جائے، دشمن کے خلاف اقدام کرنے کا اُس کے پاس یہ واحد راستہ ہے۔ تعجب ہے اگر کوئی اُس پہلے والے اقدام کو تو قابلِ تعریف اور دوسرے والے کو مستوجبِ سزا سمجھے۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلے والے کی نسبت دوسرے والا زیادہ قابلِ تعریف ٹھہرے اِس لئے کہ وہاں جان کا خطرہ چاہے جتنا بھی تھا احتمالی تھا اور یہاں یقینی۔ ایک شخص اللہ کی راہ میں شہادت اور جان کی قربانی کا حتمی اور یقینی فیصلہ کرتا ہے، حملے کے دوران اپنی حفاظت سے بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے اور صرف اِسی ایک ہدف پر توجہ مرکوز کئے ہوئے ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ کے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکے گا۔ جبکہ پہلا شوقِ شہادت کے ساتھ ساتھ یہ بھی اُمید کرتا ہے کہ زندہ لوٹ آئے گا۔ حملہ کرتے وقت اپنی حفاظت سے بھی غافل نہیں ہوتا اور اپنے بچاؤ کی فکر بھی کرتا ہے۔ اِن دو کرداروں کے درمیان جس معیار کے مطابق بھی فیصلہ کریں، جو

بھی کسوٹی استعمال کریں، عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اِس شہادت جُو کو قابلِ ترجیح قرار دے دیا جائے۔ مگر یہ تو بہت ہی ناقابلِ یقین ہے کہ کوئی منصف اِن میں سے ایک کے کام کو تو شہادت قرار دے اور دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ کر شہادت کہنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے۔

قبل اِس کے کہ کوئی یہ سوال اُٹھائے کہ نیویارک اور اسرائیل میں غیر متحارب لوگوں کے جنگ میں مارے جانے کا کیا حکم ہے تو اُس کو یہ بات مستحضر رکھنی چاہیے کہ کیا امریکیوں اور اسرائیلیوں نے یہ کام کئے ہیں یا نہیں۔ غیر متحارب لوگوں کو قتل کیا ہے یا نہیں، اِن کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں یا نہیں۔ قاتلوں کی طرفداری کرتے ہیں یا نہیں، قاتلوں کو اسلحہ اور مالی امداد دیتے رہے ہیں یا نہیں اور شہر، گاؤں اور مسجدوں پر بموں کی بارش برسائی ہے یا نہیں۔ اگر یہ سب کام اُنہوں نے کئے ہیں تو اُن کے مخالف فریق کو بھی ہر لحاظ سے اِس کا حق حاصل ہے کہ اُن کے خلاف یہ تمام کام کر ڈالے۔ اِس لحاظ سے بھی کہ وہ مظلوم ٹھہرتے ہیں لہٰذا انتقام کا حق رکھتے ہیں اور اِس لحاظ سے بھی کہ اُن کو ہر عدالت بالمثل عمل کی اجازت دیتی ہے۔ جس طرح اسرائیلی ہر فلسطینی کو متحارب سمجھتے ہیں، اُس کے قتل کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، نہ کسی بزرگ پر رحم کھاتے ہیں اور نہ بچے پر، نہ عورت پر رحم کھاتے ہیں اور نہ مرد پر۔ شیخ احمد یاسین جیسے سفید ریش، دونوں آنکھوں اور ٹانگوں سے محروم کو مسجد سے لوٹتے وقت امریکی ہیلی کاپٹروں سے راکٹ کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور متعدد دوسرے لوگوں سمیت شہید کیا جاتا ہے۔ امریکی بھی اِس جرمِ عظیم کو جائز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسرائیل اپنے دفاع کا حق رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی اُٹھ کر امریکیوں اور اسرائیلیوں کے خلاف اِسی طرح کا اقدام کر لے، تو وہ شرعاً، عقلاً اور عدلاً اِس کا حق رکھتا ہے۔ امریکیوں اور اسرائیلیوں نے اپنے فلسطین، افغانستان اور عراق میں روا رکھے گئے سلوک کی بنیاد پر ہر فلسطینی اور ہر مسلمان کو جواز فراہم کر دیا ہے کہ ہر امریکی اور اسرائیلی کو متحارب سمجھے اور اُس سے اپنا انتقام لے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی مجاہدین کو مشورہ دے اور کہے کہ: تمہیں اپنے حملوں کے دوران غیر محارب لوگوں کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنے حملوں کا ہدف دشمن کے اُن مورچوں افواج اور (Installations) کو رکھیں جن سے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکے اور اُس کی جنگی مشینری کو ایسی ضرب لگ جائے کہ اُس کی کمر ٹوٹ جائے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور جواباً کہے کہ: وہاں تک تو رسائی نہیں رکھتا ہوں، ابھی اتنی طاقت میسر نہیں ہے۔ تو وہ جہاں کہیں بھی دشمن کو پالے اپنا انتقام لے لے یہ اُس کا مشروع حق ہے۔

کسی بھی حملے کے جائز اور ناجائز ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہوتا ہے ایک مقصد کی صالحیت (sanctity of the cause) پر اور دوسرے حملہ کرنے والے کے اپنے عمل کے شعوری ادراک پر۔ کسی حملے کے دوران نقصان کا تناسب کیا ہے ۱۰

فیصد، ۹۰فیصد یا ۱۰۰ فیصد یہ جائز اور ناجائز کا ایشو ہی نہیں، بلکہ ایک تیزویراتی مسئلہ ہے۔ اگر کوئی سپہ سالار ایسا حملہ ترتیب دے سکتا ہے کہ اُس میں اپنا نقصان کم بلکہ صفر کرلے تو وہ کیوں ایسا نہیں کرے گا۔ اِس کا کسی مذہب اور عقیدے سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر ہے تو پھر سب سے زیادہ (جاپانیوں) کو خودکش حملوں کا موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے (حالانکہ جنگ عظیم دوم میں جاپانی خودکش پائلٹوں کا کردار تو کسی بھی جاپانی کا سر فخر سے بلند کرسکتا ہے مگر چونکہ مغرب کے خلاف تھے اِس لئے میڈیا میں جگہ نہ پاسکے)۔ ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ میں پاکستانی اپنے فوجیوں کا گرنیڈ پہن کر بھارتی ٹینکوں کے سامنے لیٹ جانے کی ہیروازم کی مثالیں انتہائی فخر سے دیا کرتے تھے، اور یہ ہے بھی انتہائی قابل فخر بات؛ کسی بھی قوم کے لئے اور کسی بھی مقصد سے وفاداری رکھنے والوں کے لئے۔

دوسرا نکتہ ہے اپنے عمل کا شعوری ادراک: یہ انتہائی اہم نکتہ ہے اور استشہادی حملوں کے حوالے سے انتہائی متعلق۔ حملہ کرنے والے کو اپنے عمل، اُس کے اہداف، نقصانات اور نتائج سب کے بارے میں پورا علم ہونا چاہیے اور حملہ آور لاشعوری طور پر اِس کام کے لئے اُکسائے گئے بھی کسی صورت نہیں ہونے چاہئیں۔ نیز استشہادی حملے صرف تجاوز کرنے والے برسرِپیکار اور حملہ آور دشمن کے خلاف عمل میں لائے جائیں اور وہ بھی صرف اُس صورت میں جب کسی دوسرے ذریعے اور طریقہ کار سے اُن کا حملہ روکنا اور اپنا دفاع کرنا ممکن نہ ہو۔ اِس کے باوجود اِس بات کا بھی خیال رکھنا ہو گا کہ کسی بے گناہ کو ضرر نہ پہنچے، قابلِ احترام مقامات کی بے حرمتی نہ ہو، مساجد، نماز یا جنازے کے اجتماعات، بازار اور عام لوگوں کے جمع ہونے کے مواقع کسی صورت نشانہ نہ بنائے جائیں۔

وَأَتِمُّواْ ٱلۡحَجَّ وَٱلۡعُمۡرَةَ لِلَّهِۚ فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۖ وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ بِهِۦٓ أَذٗى مِّن رَّأۡسِهِۦ فَفِدۡيَةٞ مِّن صِيَامٍ أَوۡ صَدَقَةٍ أَوۡ نُسُكٖۚ فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۚ فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ

تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمۡ يَكُنۡ أَهۡلُهُۥ حَاضِرِي ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ ﴿١٩٦﴾

(۱۹۶)۔اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے ادا کرو۔ پس اگر کہیں گِھر جاؤ تو پھر (اس کا فدیہ) قربانی کے وہ جانور ہیں جو تمہیں میسر ہوں، اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی کے یہ جانور ذبح ہونے کے اپنے مقام تک نہ پہنچ جائیں۔ تو اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اُس کے سر کے کسی حصے میں تکلیف ہو (اور سر منڈوا دے) تو پھر اُس پر فدیہ ہے روزہ یا صدقہ یا قربانی میں سے۔ تو پھر جب اطمینان کی حالت ہو تو حج کے ایام تک جو کوئی عمرے کا فائدہ اُٹھائے تو (اُس کے لئے) پھر قربانی کے وہ جانور ہیں جو اُسے میسر آئیں، تو جس کسی کو میسر نہ آئیں تو پھر حج کے دنوں میں تین دن کے روزے اور لوٹ آنے کے بعد سات روزے رکھے۔ اِس طرح یہ پورے دس روزے ہو جاتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر مسجد حرام (کے آس پاس) نہیں ہیں۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

(۱۹۶)۔ تمہارا حج اور عمرہ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہیے تو جب اِن میں سے کسی کا ارادہ کر لو تو چاہئے کہ اُسے پورا کر لو۔ لیکن اگر کوئی تاخیر یا رکاوٹ پیش آجائے تو احرام کھولنے سے پہلے پہلے قربانی کے جانور، کم از کم ایک دنبہ قربانی کے لئے حرم کی سرزمیں بھیج دو اور اُس وقت تک اپنے سر نہ منڈواؤ اور احرام نہ کھولو جب تک یہ جانور اپنی جگہ نہیں پہنچ جاتے۔ وہ بیمار جو سر کے بالوں سے تکلیف میں ہوں اور منڈانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رکھتے، وہ فدیہ دے کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ اِس کا فدیہ تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور یا ایک جانور ذبح کرنا ہے۔ اگر حج ادا کرنے پہنچ جاؤ اور یہ خواہش ہو کہ حج سے پہلے عمرہ بھی ادا کر لو تو اُس کا فدیہ ایک جانور کا ذبح کر دینا ہے۔ اِس کا کم از کم نصاب ایک بکرا (یا اونٹ، گائے کا ساتواں حصہ) ہے۔ لیکن اگر کسی کو یہ میسر نہ آئے تو اُسے دس روزے رکھنے ہوں گے جن میں سے تین دن حج کے دوران، ذوالحجہ کی دسویں سے شروع کر کے اور سات دن واپس لوٹنے کے بعد۔ تمتع کی یہ اجازت اُن لوگوں کو دی گئی ہے جو مکہ مکرمہ کے رہنے والے نہیں ہیں جبکہ مکہ کے رہنے والے حج اور عمرہ علیٰحدہ علیٰحدہ ادا کریں گے۔ باہر سے آنے والے حجاج کو یہ سہولت دی گئی ہے کہ حج اور عمرہ ایک ہی احرام میں یکے بعد دیگرے ادا کر لیں اور یا یہ کہ پہلے عمرہ ادا کر کے احرام کھول دیں اور پھر حج کے لئے از سرِ نو احرام باندھ لیں۔ ایک کو قِران اور دوسرے کو تمتع کہتے ہیں قِران اور تمتع دونوں صورتوں میں قربانی لازم ہو جاتی ہے۔

ٱلۡحَجُّ أَشۡهُرٞ مَّعۡلُومَٰتٞۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي ٱلۡحَجِّۗ وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ يَعۡلَمۡهُ ٱللَّهُۗ وَتَزَوَّدُواْ فَإِنَّ خَيۡرَ ٱلزَّادِ ٱلتَّقۡوَىٰۖ وَٱتَّقُونِ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ ﴿١٩٧﴾

(۱۹۷)۔ حج کے لئے معلوم مہینے ہیں تو جس کسی نے اِن میں حج (اپنے اوپر) فرض کر لیا، تو پھر حج کے دوران نہ کوئی شہوانی فعل (جائز) ہے، نہ بد عملی اور نہ لڑائی جھگڑے۔ اور نیکی کا جو بھی کام تم کر لوگے اللہ اُسے جانتا ہے۔ اور زادِ راہ ساتھ لے لو، پس (جان لو) کہ زادِ راہ کی خوبی، پرہیز گاری (دامن بچانا) ہے اور اے عقل والو مجھی سے ڈرو۔

---

(۱۹۷)۔ حج کے اپنے مخصوص اور معین ایام ہیں اور اِسی طرح اُس کے اپنے مخصوص آداب ہیں۔ اِس کے دوران نہ تو اپنی بیویوں سے قربت کرنے کی اجازت ہے نہ فسق اور گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑوں اور بد زبانی کی۔ حج کا لغوی معنٰی قصد و ارادہ ہے۔ حج کا ارادہ کر کے تم ایک بڑے اور بھاری کام کا بیڑا اُٹھانے کا عزم کرتے ہو، اللہ کے گھر حاضر ہونے کا عزم اور اللہ کے گھر میں اُس کے ساتھ ایک نئے عہد و پیمان کا عزم۔

اے حج ادا کرنے والے میرے بھائی: کبھی کسی وقت تیرے دل میں خیال گزرا ہو گا کہ کاش مجھے اللہ کے دربار میں رسائی کی توفیق حاصل ہو اور اُس کے روبرو ہو کر اپنی حاجات پیش کرنے کی مجال اور امکان نصیب ہو۔ تا کہ میں یہاں وہاں، در بدر، غیر کے دروازوں میں کھڑے ہونے کے بجائے اللہ کی چوکھٹ سے چمٹ جاؤں اور اپنی حاجات پوری کروانے کے لئے دوسرے ہر مرجع سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو کر اپنی عرائض اُسی کے سامنے رکھوں؟ "حج" اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اِسی ارمان، خواہش اور عزم کا جواب ہے۔ حج ادا کر کے تم یہ عزم کرتے ہو کہ میں دوسری ہر چوکھٹ سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑتا ہوں، یکسوئی سے اپنا رخ اللہ کی طرف پھیرتا ہوں، اُسے اپنے لئے کافی سمجھتا ہوں، اُسی کے گھر کا طواف کرتا ہوں اور اُسی کی چوکھٹ پر کھڑا ہوتا ہوں۔ ساتھ ہی تم یہ بھی عہد کرتے ہو کہ میں آئندہ نہ تو کسی قصر، گھر اور مزار کا طواف کروں گا اور نہ ہی مدد کے لئے کسی دوسرے دروازے پر دستک دوں گا۔ حج دوسرے ہر گھر اور در سے استغناء اور صرف اللہ کے گھر پر حاضری اور اُسی کے دروازے پر دستک کے ارادے اور عزم کا نام ہے۔ یہ عزم اور یہ ارادہ چھپتے چھپاتے اپنی مرضی کے وقت اور تنہائی میں نہیں بلکہ ببانگ دُہل، ایک معین وقت پر تمام دنیا کے حاجیوں کے ساتھ مل کر، ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر، ایک چادر اور ایک تہہ بند پر مشتمل، کفن سے ملتا جلتا یونیفارم پہن کر کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام حجاج کے ساتھ یک جہتی کے مظاہرے کا موقع ہے۔

اِس دوران تمہیں تمام اختلافات پسِ پشت ڈالنے ہیں، اپنے بناؤ سنگھار، عطر کے استعمال، ناخن اور بالوں کی تراش خراش (احساس تفاخر کے تمام آلات)، حتیٰ کہ اپنے بیویوں کے ساتھ قربت، ہر قسم کے گناہ اور لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنا ہے۔ اِس لئے کہ تم تواللہ کے گھر جارہے ہو، چاہتے ہو کہ اللہ کے گھر کا طواف کرلو۔ اِس حال میں اللہ کے ساتھ اپنے وعدے دہرا کر تازہ کرنا چاہتے ہو کہ تم نے حجرِ اسود پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں۔ تم ابراہیمؑ کے مقام پر کھڑے ہونا چاہتے ہو، ہاجرہؓ کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہو، اُسی کی طرح صفااور مروہ کے مابین سعی کرنا چاہتے ہو اور اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے ارادہ کیاہوا ہے کہ دن کی بھرپور روشنی میں منیٰ (ایمان کی جگہ) سے عرفات (معرفت کا کھلا میدان) تک چلے جاؤ اور وہاں اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز میں دن گزارنے کے بعد اگلی رات تین خطرناک دشمنوں کے تمثیلی یادگار (monuments) کے قریب والے مقام (مزدلفہ) میں پڑاؤ ڈال دو۔ یہاں سے تم نے اگلے دن کے مقابلے کے لئے اور دشمنوں پر سنگ باری کے لئے تیاری کرنی ہے۔ واضح رہے کہ کل یعنی پہلے دن تم نے صرف بڑی یادگار جمرۃ الکبریٰ پر جو پہلی اور دوسری کے عقب میں ایستادہ ہے، سنگ باری کرنی ہے۔ ہفتے کے سات دنوں کے شمار کے برابر سات پتھر، ہر ایک تقریباً بندوق کے کارتوس کی گولی کے برابر کا۔ آج کے دن تم نے پہلے دو جمرات (جمرۃ الاولیٰ اور جمرۃ الوسطیٰ) کے پاس سے گزرتے ہوئے مگر اُنہیں چھوڑ کر اُن کے عقب میں واقع سب سے بڑے دشمن کے یادگار کے مقابل جا پہنچنا ہے۔ مقابلے کے پہلے دن صرف اُسی کو نشانہ بنانا ہے مگر کل اور اُس کے بعد جتنے دن بھی منیٰ میں قیام رہے تو ہر روز اِن تینوں کو یکے بعد دیگرے پتھر مارنے ہیں۔ تمام انبیاء اپنے اپنے زمانے میں جن تین خطرناک دشمنوں سے نبرد آزمار ہے، یہ تین یادگاریں اُن تین خطرناک دشمنوں کا تمثیلی اظہار ہیں۔ یہ تین خطرناک دشمن وہی ہیں جو اللہ کے دین کے راستے کے سب سے بڑے پتھر ہیں، اللہ کے مظلوم اور بے بس بندوں پر ظلم توڑنے والے ہیں اور ہمیشہ ہر حقیقی عالم، مخلص داعی، ہر عدل پسند اور سچے مصلح کے مقابلے پر خم ٹھونک کر میدان میں نکلتے رہے ہیں۔ خوب جان لو حق کے مقابل باطل کا ساتھ دینے والے یہ دشمن زر، زور اور تزویر کی علم بردار قوتیں ہیں۔ اِن کو ہر صاحب بصیرت جانتا ہے اور تاریخ کے ہر پڑاؤ پر اُنہیں پہچان کر فرعون، ہامان اور قارون کے نام سے موسوم کر سکتا ہے۔ اِن ناموں میں سے پہلا طاقت کا نشان اور لشکروں کا مالک، دوسرا سفلی علوم کا ماہر اور تیسرا خزانوں کا مالک ہے۔ ایک جعلی سردار، دوسرا بھک منگا اور خوشامدی سیّد اور تیسرا خائن سرمایہ دار یعنی ایک خاندانی ملک، دوسرا چرب زبان مُلا اور تیسرا جابر زمیندار؛ ایک غدار بادشاہ، دوسرا مکار پیر اور تیسرا سود خور سرمایہ دار جن میں سے ایک خراج وصول کرتا ہے، دوسرا نذر و نیاز اور تیسرا سود اور بے کس محتاجوں کا خون۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿١٩٨﴾

(۱۹۸)۔ اِس میں تمہارے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ اپنے لئے اللہ کا فضل تلاش کرو۔ تو جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو اُسی طریقے سے جو اُس نے تمہیں سکھایا ہے، حالانکہ اِس سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے۔

---

(۱۹۸)۔ تم نہیں جانتے تھے کہ اللہ کو کس طرح یاد کیا جائے۔ نہ اپنے رب کو پہچانتے تھے اور نہ اُس کے ذکر کے طریقے اور آداب سے واقف تھے۔ حج کے موسم میں تجارت کرنے کو حج کے خلاف عمل نہ سمجھو اور یہ گمان نہ کرو کہ اِس میں کوئی گناہ ہوتا ہے۔ اِس موقع پر اپنا جائز فائدہ حاصل کرنے کی اجازت موجود ہے۔

مشعرِ حرام کی لفظی ترکیب اور اِس علاقے کو اِس نام سے موسوم کرنا غور کا متقاضی ہے: مشعرِ حرام (قابل قدر اور محترم شعور کی جگہ) مزدلفہ کے آخری حصے کا نام ہے۔ یہاں اللہ کو خصوصی طور پر زیادہ یاد کرنا چاہیے۔ اگلے دن تمہیں ایک اہم مقابلے کا سامنا کرنا ہے۔ وہ ہے جمرۃ الکبریٰ کو نشانہ بنانا؛ اِس کی مثال ایسی ہے جیسے دشمن کا سامنا کرنے سے پہلے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی ہدایت دی جا رہی ہو۔ اِس طرح نہیں کہ صرف زبان سے اللہ اللہ کا ورد کرو بلکہ یہاں خصوصی اور شعوری طور پر اِس بات کو مستحضر رکھو گے کہ اللہ ہر چیز کا مالک اور ہر کام پر قادر ہے۔ سب کچھ اُسی کے ارادے سے انجام پذیر ہوتا ہے، فتح اور شکست اُسی کے ہاتھ میں ہے اور زندگی اور موت کا فیصلہ وہی صادر فرماتا ہے۔ لہٰذا خوف اور ڈر، دشمن کے زور و شور اور اُس کے لشکروں اور اسلحے کا نہیں بلکہ صرف اللہ کا ہونا چاہیے۔ مزدلفہ کی اِس رات کی مثال؛ جو کھلے آسمان کے نیچے ویرانے میں تم گزارتے ہو، ایسی ہے جیسے رات کو تم دشمن کے قریب آکر پڑاؤ ڈال چکے ہو، حملے کے لئے پوری تیاری کر چکے ہو، رات دشمن کے کیمپ کے قریب ویرانے میں کھلے آسمان کے نیچے تاریکی میں بسر کرتے ہو اور کل اُس پر حملہ آور ہو گے۔

ثُمَّ أَفِيضُواْ مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسْتَغْفِرُواْ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَٰسِكَكُمْ فَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَذِكْرِكُمْ ءَابَآءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا وَمَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَٰقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُواْ ۚ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

(۱۹۹)۔ اور پھر وہاں سے جہاں سے سب لوگ واپس ہوتے ہیں تم بھی واپس ہو جاؤ اور اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو۔ بے شک اللہ مہربان بخشنے والا ہے۔ (۲۰۰)۔ اور جب اپنے مناسک مکمل کر لو، تو اللہ کو اُس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے تھے یا اُس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ۔ لیکن لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں عطا کر، تو اِن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ (۲۰۱)۔ اور اِن میں سے بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ (۲۰۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے نصیب میں اپنی محنت کی کمائی کا خاص حصہ ہے اور اللہ سرعت کے ساتھ محاسبہ کرنے والا ہے۔

---

(۱۹۹)۔ حج میں سے آپ کا اُتر آنا بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہونا چاہیے نہ کہ قریش کی طرح؛ جو عرفات نہیں جایا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عرفات حرم کی حدود سے باہر ہے اور مزدلفہ ہی سے طواف کے لئے مکہ لوٹ آتے تھے۔ دراصل وہ عوام یعنی غیر قریش سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے مگر اِس کے لئے بھی اُنہوں نے ایک مذہبی حیلہ تراشا ہوا تھا۔ کہتے تھے: عرفات حرم کی حدود سے باہر واقع ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ حرم کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ انہوں نے کعبہ کے اُس ڈیزائن کو بھی بدل ڈالا جس پر ابراہیم علیہ السلام نے اُس کی تعمیر کی تھی۔ خانہ کعبہ کے فرش کو اُونچا کیا اور اِس کا ایک دروازہ بند کر کے دوسرے کو تالہ لگا دیا۔ اپنی مرضی کی شخصیات کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اِس میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ وہ گھر جو اللہ نے "الناس" کے لئے بنایا تھا، اُس میں دو دروازے رکھوائے تھے اور ہر کوئی بغیر روک ٹوک کے جس دروازے سے چاہتا اُس میں داخل ہو سکتا تھا؛ اُسے قریش نے طبقاتی نظام سے منسلک کر کے صرف خواص کے داخلے کے لئے مخصوص کر دیا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ عرفات سے اُتر آنے کے لئے فرماتا ہے کہ سب لوگوں کے ساتھ اکٹھے اُترا کرو، اِس طرح یہ زندگی کے ہر میدان کے لئے ایک اہم ہدایت ہے۔ جہاد کے میدان میں بھی اِس کی بے پناہ اہمیت ہے، دشمن کے ساتھ معرکے کی صورت میں بھی آپکا میدان سے نکلنا ایک منظم طریقے پر ہونا چاہیے یعنی سب کے ساتھ مل کر، نہ کہ جدا جدا غیر منظم صورت میں۔ غیر منظم اور منتشر واپسی اکثر بڑی بڑی مشکلات کا باعث بن جاتی ہے اور کئی دفعہ ایک فاتح لشکر کی فتح کو شکست میں بدل دیتی ہے۔ اِس بات کو مستحضر رکھیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے حج کو مکمل اسلام سے موسوم کیا ہے۔ حج کے مناسک میں اسلام کی تمام تمثیلیں جمع ہیں، اِس کے لباس میں لباس کا حرام وحلال، اِس کے حجاب میں حجاب کی حدود، اِس کے جمع صلوٰتین میں جمع صلوٰتین کی تمثیل ــــــ کا بیان ہے۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ کوئی چیز حج میں تو جائز ہو گی اور حرم سے باہر آ کر حرام ہو جائے گی اِس لئے کہ تقویٰ اور پرہیز کا سب سے عالی مقام یہی ہے۔ یہاں پر اللہ نے جس چیز کو جائز قرار دیا ہے وہ یہاں سے باہر بدرجہ اولیٰ جائز ہے اور جو کچھ یہاں حرام قرار دیا گیا ہے یہاں سے باہر بھی حرام ہے۔ فسق اور جدال یہاں حرام کئے گئے ہیں، یہاں سے باہر بھی حرام ہیں۔ احرام میں اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت حرام ہے، یہاں سے باہر بھی روزہ اور اعتکاف کی حالت میں حرام ہے۔ عورت اور مرد کے ستر اور حجاب کے لازمی اور فرضی حدود وہی ہیں جن کی حج کے دوران پابندی لازم کی گئی ہے اور جمع صلوٰتین اور تقدیم وتاخیر کا حکم بھی وہی ہے جو عرفات میں جاری فرمایا گیا ہے۔

(۲۰۰۔۲۰۲)۔ تمہارے حج کا حاصل یہ ہونا چاہیے کہ اپنے رب کے ساتھ تمہارا تعلق مضبوط ہو جائے۔ اِس کے بعد اُس کے نام سے تمہاری زبان ہمیشہ تر رہے اور ہر چیز اور ہر کسی سے زیادہ اُسی کی یاد تمہارے دل میں موجزن رہے، اپنے باپ سے بھی زیادہ۔ اُن لوگوں میں سے نہیں بننا جو صرف دنیا کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہی جو اللہ سے اگر کبھی کچھ مانگتے بھی ہیں تو صرف دنیا مانگتے ہیں؛ پس تم اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کے طلبگار رہنا۔

وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِى يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

(۲۰۳)۔ اور گنتی کے اِن دنوں میں اللہ کا ذکر کرو، تو اُن دو دنوں میں جس نے جلدی کی، اُس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی؛ اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے تقویٰ کیا اور اللہ سے ڈرے اور بے شک تم اللہ کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔

---

(۲۰۳)۔ منیٰ میں قیام کے دوران اپنے رب کو خوب یاد کرو، دو دن ہوں یا تین، نہ جلدی کرنے والے پر کوئی الزام ہے اور نہ تاخیر کرنے والے پر۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُعۡجِبُكَ قَوۡلُهُۥ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلۡبِهِۦ وَهُوَ أَلَدُّ ٱلۡخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي ٱلۡأَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيهَا وَيُهۡلِكَ ٱلۡحَرۡثَ وَٱلنَّسۡلَۚ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلۡفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتۡهُ ٱلۡعِزَّةُ بِٱلۡإِثۡمِۚ فَحَسۡبُهُۥ جَهَنَّمُۖ وَلَبِئۡسَ ٱلۡمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾

(۲۰۴)۔ اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جس کی دنیا کے بارے میں گفتگو تمہیں حیران کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے حالانکہ یہ بدترین دشمن (دین) ہے۔ (۲۰۵)۔ مگر جب (تم سے) لوٹ جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی تگ و دو کرتا ہے اور فصل اور نسل کو تباہ کرتا ہے اور اللہ تو فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ (۲۰۶)۔ اور جب اُسے کہا جاتا ہے کہ: خدا سے ڈرو تو عزتِ نفس (وقار) اُس کو گناہ پر جما دیتا ہے پس جہنم اُس کے لئے کافی ہے اور کتنا برا ہے وہ ٹھکانا۔

(۲۰۴)۔ پہلے والے دو گروہوں کے بعد اب اُس گروہ کا تعارف کرایا جا رہا ہے جس کا ظاہر دوستانہ، گفتگو حیران کُن، دنیاوی معاملات میں باتیں دلکش اور متاثر کُن مگر درحقیقت سب سے زیادہ خطرناک اور کینہ پرور دشمن ہے۔ یہ افراد مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو اُن کے ساتھی ظاہر کرتے ہیں قسمیں کھاتے ہیں کہ اِن کے دلوں میں راسخ ایمان اور مسلمانوں کے ساتھ شدید محبت موجود ہے۔

(۲۰۵)۔ مگر جب واپس اپنے ساتھیوں میں پلٹ آتے ہیں اور یا اقتدار ہاتھ میں آجاتا ہے اور لوگوں کے معاملات اُن کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں تو پھر اُن کی تمام تر کوششوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں فساد پھیلاتے ہیں۔ لڑائی جھگڑوں کی آگ کو اپنے دامن سے ہوا دیتے ہیں، کافروں کو مسلمانوں پر حملے کرنے کے لئے اُکساتے ہیں اور آخرکار خونریزی اور فصلوں کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے دلوں کے حال پر شاہد ٹھہراتے ہیں حالانکہ اِن کے دل فساد سے بھرے ہوئے ہیں، جبکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

(۲۰۶)۔ جب اُن کے کرتوتوں پر تنقید کی جاتی ہے اور اُنہیں کہا جاتا ہے کہ گناہ سے کنارہ کش ہو جائیں تو اِسے اپنی عزت کے منافی سمجھتے ہیں، اپنے گناہوں کا دفاع کرتے ہیں اور مزید گناہوں پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اِس مبارک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کے مقابل حساسیت کا مظاہرہ اور پُرخلوص نصیحت کو اپنی عزت پر حملہ سمجھنا نفاق کی علامت ہے۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشۡرِى نَفۡسَهُ ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ رَءُوفُۢ بِٱلۡعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

(۲۰۷)۔ اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اپنا آپ اللہ کی رضا کی تلاش میں بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے (اِن) بندوں پر رؤف ہے۔

---

(۲۰۷)۔ اوپر ذکر کئے گئے منافقین کے برعکس کچھ لوگ پھر ایسے ہیں جو اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرتے ہیں۔ اُن کا مقصد صرف اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اِن مخلص بندوں کے لئے بہت رحم دل اور مہربان ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱدۡخُلُواْ فِى ٱلسِّلۡمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَـٰنِ ۚ إِنَّهُۥ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٠٨﴾ فَإِن زَلَلۡتُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ ٱلۡبَيِّنَـٰتُ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾

(۲۰۸)۔ اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو، وہ تو بے شک تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (۲۰۹)۔ واضح نشانیاں آنے کے بعد بھی اگر تم پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ باحکمت غالب ہے۔

(۲۰۸۔۲۰۹)۔ اسلام میں پورے کے پورے، مکمل طور پر داخل ہونا لازم ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی بھی حصہ اسلام سے باہر نہیں رہنا چاہیے اور تمہیں کسی چیز میں بھی شیطان کی متابعت نہیں کرنی چاہیئے۔ اُس کے نقشِ پا پر ایک قدم بھی نہیں چلنا چاہیئے بلکہ اُسے اپنا دشمن سمجھنا ہے اور اگر پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ عزت اور غلبے کا مالک بھی ہے اور حکیم بھی۔ وہ اپنے دین کا دفاع کرنا جانتا بھی ہے اور اُس پر قادر بھی ہے۔ تمہاری کوئی لغزش اُسے اور اُس کے دین کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأۡتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِى ظُلَلٍ مِّنَ ٱلۡغَمَامِ وَٱلۡمَلَـٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ ٱلۡأَمۡرُ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرۡجَعُ ٱلۡأُمُورُ ﴿٢١٠﴾

(۲۱۰)۔ کیا لوگ اِس کے علاوہ اب اِس چیز کے منتظر ہیں کہ اللہ خود بادلوں کے سائے میں آموجود ہو اور فرشتے بھی اور معاملے کا فیصلہ ہی کر ڈالا جائے۔ آخر کار تمام معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔

(۲۱۰)۔ اگر اِن تمام دلائل کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لاتے اور اسلام میں پوری طرح داخل نہیں ہوتے تو اِس کے علاوہ اور کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اور فرشتے بادلوں کا چتر لگائے نمودار ہوں اور جس عذاب کا وعدہ اِن کے ساتھ کیا گیا ہے وہ واقع ہو جائے؟ ہر کام اور فیصلے کا آخری مرجع اللہ ہے اور ہر کام کا فیصلہ وہی کرتا ہے۔ یہ لوگ مطمئن رہیں کہ یہ کام تو ہر قیمت پر انجام پذیر ہونا ہے ہی، کوئی نہیں جو اِس کا راستہ روک سکے۔

سَلْ بَنِیٓ إِسْرَٰٓءِیلَ كَمْ ءَاتَیْنَٰهُم مِّنْ ءَایَةٍۭ بَیِّنَةٍ ۗ وَمَن یُبَدِّلْ نِعْمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِیدُ ٱلْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُیِّنَ لِلَّذِینَ كَفَرُوا۟ ٱلْحَیَوٰةُ ٱلدُّنْیَا وَیَسْخَرُونَ مِنَ ٱلَّذِینَ ءَامَنُوا۟ ۘ وَٱلَّذِینَ ٱتَّقَوْا۟ فَوْقَهُمْ یَوْمَ ٱلْقِیَٰمَةِ ۗ وَٱللَّهُ یَرْزُقُ مَن یَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

(۲۱۱)۔ اور بنی اسرائیل سے پوچھو کہ کتنی کھلی نشانیاں ہم نے اُن کو دیں؟ اور جو اللہ کی نعمت مل جانے کے بعد اُس کو بدل دیتے ہیں تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۲۱۲) جو لوگ کافر ہوئے ہیں اُن کے لئے دنیا کی زندگی مزیّن کی گئی ہے اور وہ ایمان لانے والوں کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔ اور جنہوں نے پرہیز گاری اختیار کی؛ تو قیامت کے دن وہ اِن کے مقابلے میں بالاتر ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

---

(۲۱۱)۔ جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی ہے اور اُس کی نعمتوں کو اُس کی منشاء اور رضا کے خلاف غلط راہوں میں لگایا ہے، اللہ کے شدید عذاب میں مبتلا ہوئے ہیں، بنی اسرائیل اِس کی اچھی مثال ہیں۔

(۲۱۲)۔ کافروں کی دانست میں مال و متاع کی فراوانی حق و باطل کے لئے معیار ہے۔ یہ جب حرام راستوں سے مال و دولت جمع کر لیتے ہیں تو اُس پر فخر کرتے ہیں۔ اُن کا مال اُن کو اِس بات پر اُکساتا ہے کہ مومنوں پر اِس وجہ سے تمسخر کریں کہ اُنہوں نے حرام سے اپنا دامن بچایا ہے اور نہ صرف اپنے حلال رزق پر اکتفاء کیے ہوئے ہیں بلکہ اُسے بھی اللہ کی راہ میں لُٹاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کافروں کی نظر میں قابلِ استہزا و تمسخر ہے۔ اِن کو قیامت کے دن پتہ چل جائے گا کہ مومنوں کا مقام اِن سے کتنا بلند ہے۔ دنیا میں تو اللہ اپنے بعض بندوں کو کسی حساب کتاب کے بغیر رزق دیتا ہے۔ یعنی اِس کی پروا نہیں کرتا کہ وہ رزق کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ رزق و روزی کی بابت اللہ کی سنت یہ نہیں ہے کہ صرف صالح اور مستحق کو عطا کرتا ہے چاہے دراصل اللہ نے یہ سب کچھ مومنوں کے لئے ہی کیوں نہ پیدا فرمایا ہو۔

كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ فِيمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ ۚ وَمَا ٱخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا ٱلَّذِينَ أُوتُوهُ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَـٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلْحَقِّ بِإِذْنِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ يَهْدِى مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

(۲۱۳)۔ تمام لوگ ایک اُمت اور گروہ تھے، تو اللہ نے خوشخبری دینے اور انذار کرنے والے انبیاء بھیجے اور اُن کے ساتھ حقیقی کتاب نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے مابین اُس چیز کا فیصلہ فرمادے جس میں اُنہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور اختلاف تو اُن کے علاوہ کسی نے نہیں کیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی اور یہ بھی آپس کے زیادتی کی وجہ سے اور بعد اِس کے کہ اُن کو کھلی نشانیاں دکھائی گئیں۔ پس اللہ نے اپنے حکم سے مختلف الفیہہ چیزوں میں اُن لوگوں کی رہنمائی کی جو ایمان لائے، اور اللہ جس کسی کو چاہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

---

(۲۱۳)۔ پیغمبروں کی بعثت سے پہلے لوگ یکساں حد تک حق سے بے بہرہ، اختلافات میں غرق، گمراہ اور ظلم، جہل اور فساد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ نے اِن کی رہنمائی کے لئے ایسے پیغمبر بھیجے جو گمراہ انسانوں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرائیں اور اُنہیں بتائیں کہ اُن کی موجودہ انفرادی زندگی، اجتماعی اور اقتصادی نظام، اخلاقی روابط اور لین دین کے طریقوں کا انجام اِس دنیا میں بھی انتہائی بُرا ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر آپ اِس سے کنارہ کش ہو جائیں، حق کے آگے جھک جائیں، اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئیں، اللہ کے دین کو تسلیم کر لیں تو دنیا اور آخرت کی سعادت اور نیک بختی سے سرفراز ہو جائیں گے۔ پیغمبر بشیر بھی ہوتا ہے اور نذیر بھی اور اُس کی دعوت کے وارث بھی بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی بدکار اور ظالموں کی راہ روکیں اور اُنہیں ظلم اور فساد کے بُرے انجام سے ڈرائیں جبکہ مظلوموں کو سچائی کی راہ دکھائیں اور سیدھی راہ پر چلنے کے اچھے انجام کی بشارت دیں۔ تو جو کوئی ایمان لایا اُسے راہِ حق کی ہدایت نصیب ہو گئی اور وہ، وہ تمام حقائق جان گیا جس میں وہ خود اور دوسرے لوگ اختلاف کرتے تھے۔

كان الناس أمة واحدة کا صحیح اور دقیق معنٰی یہی ہے کہ پیغمبروں کی بعثت سے پہلے تمام لوگ ایک گروہ، سب ایک دوسرے کی مانند اور اختلافات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دنیا پر ظلم اور جہل چھایا ہوا تھا اور بحر و بر پر فساد نے اپنے پر پھیلائے ہوئے تھے۔ ہر نئے پیغمبر کے آنے پر بعض لوگ راہِ حق کی ہدایت پا جاتے ہیں، صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتے ہیں اور دنیا تباہی سے بچالی جاتی ہے۔ مگر پیغمبر جو چراغ روشن کرتے ہیں وہ ایک وقت تک روشنی دیتے رہتے اور لوگوں کو راہِ حق دکھاتے رہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ لوگ آہستہ آہستہ اُن چراغوں سے دور ہوتے جاتے ہیں اور دوبارہ ظلم وفساد کی راہ پر چل نکلتے ہیں تو اللہ ایک نیا پیغمبر مبعوث کر دیتا ہے۔ اِن آیات میں انبیاء کی بعثت سے قبل والی حالت کی طرف (امتِ واحدہ) کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے اور سورۂ یونس کی آیت ۱۹ میں اُن کے جانے کے بعد کی حالت بیان کی گئی ہے:

وَمَا كَانَ ٱلنَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَٱخْتَلَفُوا۟ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ سورہ یونس ۱۹

اور لوگ تو صرف ایک اُمت تھے۔ پھر اختلافات میں پڑ گئے اور اگر تمہارے رب کی طرف سے پہلے ہی کہا نہ گیا ہوتا تو وہ اُن کے مابین ضرور اُس معاملے کا فیصلہ کر دیتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

بعض (فاختلفوا) کا لفظ آیت زیرِ بحث میں بھی مقدر سمجھتے ہیں حالانکہ اِس کی نہ تو ضرورت ہے، نہ آیت کی ترکیب اِس کی اجازت دیتی ہے اور نہ اگلے پچھلے فقروں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں اپنی طرف سے بلاضرورت کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

قرآن کی آیات میں بلاضرورت کوئی چیز زائد سمجھ بیٹھنا اور اُسے نظر انداز کرنا یا کوئی چیز کم سمجھ کر مخصوص الفاظ سے اِس کمی کو پورا کرنا یا تو اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جو آیت کے اصل الفاظ یا اُن کی ترکیب سے درست مطلب اخذ نہیں کر سکتے یا پھر وہ جو پہلے سے ایک مخصوص رائے اور نقطہ نظر کے حامی ہوتے ہیں اور آیت کو اپنی رائے اور نقطہ نظر کی تائید کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ کچھ کم کر کے اُسے زائد کا نام دے دیتے ہیں یا کچھ بڑھا کر اُسے مقدر کہہ دیتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوْا۟ مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ ٱلْبَأْسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوا۟ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصْرُ ٱللَّهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

(۲۱۴)۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہارے اوپر اُن لوگوں کے حالات نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ مشکلات اور سختیوں سے گزارے گئے اور ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ پیغمبر اور اُس کے ساتھ کے مومن پکار اُٹھے: اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

---

(۲۱۴)۔ اِس آیت سے نہایت صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا راستہ آزمائشوں اور مشکلات سے پٹا پڑا ہے۔ جنت تک پہنچنے اور دشمن پر بالادستی حاصل کرنے کی اُمید صرف اُس صورت میں درخورِ اعتنا قرار دی جاسکتی ہے جب ہم آزمائشوں سے

سرخرو ہو کر گزر جائیں۔ اِس سے پہلے اِس قِسم کی اُمید صرف ایک خواہش، گمان اور سراب ہی کہلائی جا سکتی ہے۔ تاریخ کے طویل سفر میں ہر پیغمبر اور اُس کی اُمت اِس راہ میں آزمائی گئی ہے۔ تمام کے تمام خطرات کا سامنا کرتے رہے ہیں، اُنہوں نے مشکلات برداشت کی ہیں اور بڑے سخت مرحلوں سے گزرے ہیں۔ اِس قدر سخت مصیبتیں اور مشکلات کہ اولوالعزم پیغمبروں اور اُن کے صابر ساتھیوں کے حوصلے بھی ٹوٹنے کے قریب پہنچ گئے اور مجبور ہو گئے کہ پکار اُٹھیں کہ: اللہ کے نصرت کا وعدہ کب پورا ہو گا؟ تو اُس وقت اور سخت مشکلات کے اُس مرحلے پر پہنچنے کے بعد اُنہیں کہا گیا ہے کہ: مطمئن رہو! اللہ کی مدد قریب ہے۔ جو کوئی ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور اِس قِسم کے ابتلاؤں سے اُس کا واسطہ نہیں پڑتا؛ اُس کے بارے میں ہم صرف ایک بات کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ: یہ صاحب اُس راستے پر نہیں چل رہا جس پر انبیاء چلے ہیں۔ اِس کا راستہ وہ راستہ نہیں ہے جو جنت میں جا نکلتا ہے۔ اِس نے شر اور فساد کی قوتوں کے ساتھ صلح صفائی کا راستہ اپنایا ہوا ہے، اسی لئے مشکلات سے مامون ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی حقیقی معنوں میں ایمان کی راہ پر چل رہا ہو، کفر، شر اور فساد کی قوتوں کے ساتھ ایمان کے تقاضوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے ہو اور اِس کے باوجود آزمائشوں میں مبتلا نہ ہو رہا ہو۔ حق وعدل کے دشمن اُسے آرام سے جینے دے رہے ہوں اور اُس کے درپئے آزار نہ ہوں۔

يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا۟ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

(۲۱۵)۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں؟ اِنہیں کہو: منتخب (مال) میں سے جو کچھ بھی خرچ کرنا چاہو، تو وہ تمہارے ماں باپ کے لئے، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور بے کس مسافروں کے لئے ہو اور ہر وہ اچھا کام جو آپ کر گزریں اللہ اُسے جانتا ہے۔

---

(۲۱۵)۔ اِنہوں نے پوچھا تھا کہ کیا خرچ کریں جس کے جواب میں ایک طرف تو بہتر مدات بتائی گئیں اور دوسری طرف مال اور جمع پونجی کو خیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یعنی اگر تم حلال ذرائع سے مال کما لو اور اِن مدات میں خرچ کر لو تو چاہے کم ہو یا زیادہ، اللہ اُسے جانتا ہے اور وہ اُس کا بہتر بدلہ دے گا۔

كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٞ لَّكُمۡۖ وَعَسَىٰٓ أَن تَكۡرَهُواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ شَرّٞ لَّكُمۡۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

(۲۱۶)۔ تم پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناپسندیدہ لگتا ہے۔ ممکن ہے کوئی چیز تمہیں اچھی نہ لگے اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ کسی چیز سے آپ کو رغبت ہو اور وہ تمہارے لئے بہت نقصان دہ ہو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

---

(۲۱۶)۔ انسان طبعی طور پر لڑائی جھگڑے سے نفرت کرتا ہے۔ لڑائی سے دور صلح اور امن کی گود میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مگر یہ خواہش مفت میں اور آسانی سے پوری نہیں ہوسکتی۔ شر اور فساد کی قوتیں برداشت نہیں کرتیں کہ امن دوست انسان آرام و سکون کی فضا میں گزر بسر کرے۔ لڑائی کے بغیر صلح، عدل اور امن کی ضمانت نہیں دی جاسکتی اِسی لئے اللہ نے مسلمانوں پر جنگ فرض کی ہے۔ یہ اُس علیم خدا کی طرف سے فرض کی گئی ہے جو انسان کی فطرت اور طبیعت سے، اُس کے معاشرے کی ضروریات سے اور عدل و امن کی فراہمی کے لئے لڑائی کی ضرورت سے بدرجہ اتم واقف ہے۔ نہ اپنے نفس اور شیطان کے وسوسوں پر کان دھریں اور نہ اُن امن پسندوں کے استدلال کو اہمیت دیں جو لڑائی کی مخالفت کرتے ہیں۔ امن چاہتے ہیں مگر امن کے لئے قربانی دینے پر تیار نہیں ہیں اور شر و فساد کی طاقتوں کے مقابلے کی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے۔ اگرچہ یہاں قتال کی فرضیت کی ابتدائی ہدایت میں کہا گیا ہے کہ قتال تمہیں ناپسند ہے مگر بعد والی آیات میں کہا گیا ہے کہ جس کسی میں اللہ کی راہ میں جہاد (قتال) کے ساتھ اپنے ماں باپ، اولاد، بھائیوں، رشتہ داروں، بیوی، مال و دولت، تجارت، اور خوبصورت مکانوں کی محبت سے زیادہ شدید رغبت نہ پائی جائے وہی فاسق ہے اور اللہ کی ہدایت سے محروم ہے:

قُلۡ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمۡ وَأَبۡنَآؤُكُمۡ وَإِخۡوَٰنُكُمۡ وَأَزۡوَٰجُكُمۡ وَعَشِيرَتُكُمۡ وَأَمۡوَٰلٌ ٱقۡتَرَفۡتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٞ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَآ أَحَبَّ إِلَيۡكُم مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَجِهَادٖ فِي سَبِيلِهِۦ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّىٰ يَأۡتِيَ ٱللَّهُ بِأَمۡرِهِۦۗ وَٱللَّهُ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡفَٰسِقِينَ ﴿٢٤﴾ التوبہ ۲۴

اِنہیں کہو! کہ تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، وہ مال جو تم نے جمع کیا ہوا ہے، وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں خوف رہتا ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر تمہیں اللہ سے، اُس کے پیغمبر سے اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو کیونکہ اللہ ایسی فاسد قوم کو ہدایت نہیں بخشتا۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ ٱلْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَـٰتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ ٱسْتَطَـٰعُوا۟ ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَـٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۖ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ أَصْحَـٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴿٢١٧﴾

(۲۱۷)۔ ماہ حرام میں لڑنے کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں، اِنہیں کہو کہ: اِس میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے مگر اللہ کی راہ میں مانع ہونا، اُس کا انکار، مسجد حرام کی راہ میں رکاوٹ بننا اور اُس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اِس سے بھی بڑا ہے۔ اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے، اور ہمیشہ یہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے تا آنکہ تمہیں اپنے دین سے برگشتہ کر دیں اگر اِن کا بس چلے۔ اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائیں اور ایسے حال میں مر جائیں کہ وہ کافر ہوں، تو اُن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت چلے جائیں گے اور یہ وہ دوزخی ہیں جو اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

---

(۲۱۷)۔ ایک مرتبہ پیغمبر علیہ السلام نے حرام مہینہ شروع ہونے سے قبل مجاہدین کا ایک گروہ کفار پر حملے کے لئے بھیجا مگر یہ حملہ ماہ حرام سے ایک دن قبل اور ایک دوسری روایت میں اُس کے پہلے دن وقوع پذیر ہوا۔ قریش نے پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ دیکھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام مہینوں کا احترام بھی پامال کرنا شروع کیا۔ بعض اُن جہاد مخالف امن پسندوں نے بھی جو در حقیقت منحرف اور گمراہ تھے، اپنی بزدلی اور منافقت کو تقویٰ کا لباس پہنا کر اُن کی دیکھا دیکھی یہی شور مچانا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے: یہ درست ہے کہ ماہِ حرام میں لڑنا عظیم (گناہ) ہے مگر تمہیں اِس پر اعتراض کا کیا حق حاصل ہے۔ تم نے تو مظلوم مسلمانوں کو مسجد الحرام سے نکال دیا، اُن کے حج اور عمرے کا راستہ روکا، اللہ کی راہ میں رکاوٹ بن گئے اور اللہ کے برحق دین کے بجائے کفر کے اقتدار کے خواہاں ہوئے۔ یہ کچھ تو اللہ کے نزدیک قتل وخونریزی سے بڑا گناہ ہے پھر تم کس منہ سے اعتراض کرتے ہو۔ اگر تم نے کبھی مسجدِ الحرام اور حرام مہینوں کا احترام رکھا ہوتا تو تمہیں اعتراض کا حق حاصل ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کو بھی بتایا گیا ہے کہ شر اور فساد کی یہ کافرانہ طاقتیں تمہاری اور ہر حق پرست کی دائمی دشمن ہیں اگر اِن کے بس میں ہو تا تو ہمیشہ تم سے لڑائی جاری رکھتے تا آنکہ تمہیں اپنے دین سے برگشتہ کر دیں۔ یہ نہ اللہ کے حکم کی پرواکرتے اور نہ مسجدِ حرام اور حرام مہینوں کی۔ اِن مہینوں میں اِن کی لڑائی نہ کرنے کی وجہ

اِن مہینوں کا احترام نہیں بلکہ اِن کی اپنی ناتوانی ہے۔ خبردار صلح اور امن کے جھوٹے علمبر داروں کے پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر اپنے دین سے پھر نہ جانا اور جہاد نہ چھوڑ دینا۔ جو کوئی اُلٹے قدموں پھر جاتا ہے اور جہاد چھوڑ بیٹھتا ہے اُس کے اعمال اِس طرح تباہ ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اُن پر دنیا میں اچھے نتائج مترتب ہوتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں۔ دوزخ ہی اُس کا ٹھکانا ہو گا۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أُوْلَٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

(۲۱۸)۔ بے شک وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؛ اللہ کی رحمت اور نوازشوں کے امیدوار ہیں اور اللہ مہربان بخشنے والا ہے۔

(۲۱۸)۔ یہ سب کچھ اِس اُمید پر یہ لوگ کر رہے ہیں کہ اللہ اِن پر رحم فرمائے۔ تو اِن سے اگر جہاد کے دوران کوئی لغزش ہوتی ہے تو مہربان اور معاف کرنے والا اللہ اُسے معاف کر دے گا۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَاۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ ٱلْعَفْوَۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْأٓيَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِي ٱلدُّنْيَا وَٱلْأٓخِرَةِۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْيَتَٰمَىٰۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَٰنُكُمْۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ ٱلْمُفْسِدَ مِنَ ٱلْمُصْلِحِۚ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾

(۲۱۹)۔ شراب اور جوئے کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں، اِنہیں کہو: اِن میں بہت گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے۔ مگر گناہ اِن کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں؟ اِنہیں کہو: وہی جو فاضل بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے یہ آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم تفکّر کرو (۲۲۰)۔ دنیا اور آخرت میں؛ اور یتیموں کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں،

اِنہیں کہو: اُن کی بہبود میں دوڑ دھوپ بہتر ہے اور اگر اُنہیں اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ مفسد کو مصلح سے علیٰحدہ پہچانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو حتماً تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ باحکمت غالب ذات ہے۔

(۲۱۹۔۲۲۰)۔ ملاحظہ کریں یہاں (اثم: گناہ) کے مقابل (منفعت: فائدے) کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس سے بڑی وضاحت کے ساتھ پتہ چلتا ہے کہ حرام و حلال کے مقرر کرنے میں اِس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کونسی چیز انسان کے فائدے کی ہے اور کونسی نقصان دہ ہے۔ ہر وہ چیز جس میں انسان کے لئے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ ہوتا ہے اللہ نے اُسے حرام قرار دیا ہے اور وہ چیزیں جن کا فائدہ نقصان سے بڑھا ہوا ہو وہ حلال قرار دی گئی ہیں۔ شراب اور جوا اِس لئے حرام کئے گئے ہیں کہ اُن کا نقصان اُن کے فائدے سے زیادہ ہے، فرد کے لئے بھی اور معاشرے کے لئے بھی۔ شراب انسان کو اپنی طبیعی حالت سے نکال باہر کر دیتی ہے۔ اُسے اپنے حواس اور شعور سے بیگانہ کر دیتی ہے اور اُن کاموں پر اُبھارتی ہے جنہیں کرنا وہ عام حالت میں کبھی پسند نہیں کرے گا۔ جوا ناجائز طور پر دوسرے کا مال ہتھیانے کا ذریعہ ہے۔ اِس کی بدولت اُس حریص انسان کو دام میں لایا جاتا ہے جو آسان راستوں سے زیادہ مال و دولت کمانا چاہتا ہے۔ اُس کی اِس کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ماہر دھوکہ باز اُس سے اُس کی موجودہ ثروت کو بھی ہتھیا کر غارت کر دیتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اب تو حکومتیں بھی اپنے عوام کے ساتھ یہی دھوکہ کرتی ہیں۔ لاٹری کے دلفریب اعلانات میں کہا جاتا ہے: آئیں اپنی قسمت آزمائیں، لکھ پتی (Millioneer) بننے کا زرین موقع نہ گنوائیں، بیس روپے کے ایک ٹکٹ میں اپنے سارے ارمان پورے کریں وغیرہ وغیرہ۔ ناسمجھ اور حریص لوگوں کو اِن دلفریب اعلانات کا جھانسا دے کر ہزاروں لوگوں سے پیسہ بٹور لیتے ہیں اور اُس میں سے پانچ فیصد اُن نام نہاد خوش قسمتوں کو دے کر باقی رقم کو چور اور خائن اربابِ اختیار اپنے عیش و عشرت کا سامان بنا لیتے ہیں۔

انفاق کے بارے میں یہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ تمہاری لازمی ضروریات سے جو کچھ بچ جائے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اِس ہدایت سے واضح طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ لازمی ضروریات سے اضافی چیزوں کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ وہ انفاق کی جائیں۔ اگر تمہارے آس پاس ایسا کوئی شخص موجود ہے جو تمہاری مدد کا محتاج ہے تو اللہ نے تمہیں مکلف کر رکھا ہے کہ اپنے اضافی مال سے اُس کی مدد کرو۔ تمہارے مال میں اِن محتاج لوگوں کا خاص حق موجود ہے چاہیے کہ وہ ادا کر دو۔

یتیموں کے بارے میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اُن کے لئے اُن کا مال بہتر اور مفید طریقے سے استعمال میں لائیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے اپنے مال کی حفاظت کرتے ہو اور اُس میں اِس طرح تصرف کریں کہ یتیموں کے لئے زیادہ سے زیادہ بارآور بنے۔ اگر اُن کے مال کو علیٰحدہ سے ایک مستقل مد میں ڈال کر نہیں رکھ سکتے تو اپنے ساتھ شریک کر لیں۔ اِسے اللہ کی ایک

مہربانی سمجھ لیں کہ اُس نے یتیموں کے بارے میں اِس سے زیادہ بھاری بوجھ تمہارے اوپر نہیں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ عزیز ہے ہر چیز پر قادر اور حکیم ہے؛ اُس کے ہر حکم میں حکمتیں مضمر ہیں۔

وَلَا تَنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُواْ ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُوْلَٰٓئِكَ يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِ ۖ وَٱللَّهُ يَدْعُوٓاْ إِلَى ٱلْجَنَّةِ وَٱلْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۦ ۖ وَيُبَيِّنُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

(۲۲۱) مشرک عورتوں کے ساتھ اُس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہیں لاتیں اور ایماندار لونڈی مشرک بیوی سے بدرجہا بہتر ہے اگرچہ وہ آپ کو اچھی لگی ہو۔ اور اُس وقت تک (کسی کو) مشرکوں کے نکاح میں نہ دیا کرو جب تک وہ ایمان نہیں لاتے، ایک ایماندار غلام مشرک مرد سے بدرجہا بہتر ہے چاہے وہ آپ کو پسند ہو۔ وہ تو آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تم کو اپنے اذن اور حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیات لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

(۲۲۱)۔ یہاں دو باتوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

- قرآن نے پچھلی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو اہلِ کتاب کے نام سے موسوم کیا ہے اور بت پرستوں کو مشرک کے نام سے۔ قرآن جب اِن دونوں کا ایک ہی مقام پر ذکر کرتا ہے تو ایک کو مشرک اور دوسرے کو اہلِ کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے مگر جگہ جگہ اہلِ کتاب کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ بھی شرک سے آلودہ ہیں اور مشرک ہیں۔ اِس آیت میں ہر مشرک کے ساتھ نکاح کی ممانعت آئی ہے مگر ایک دوسری جگہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز قرار دیا گیا ہے۔ اِس کا یا تو یہ معنیٰ ہے کہ اِس عام حکم سے اہلِ کتاب کی عورتیں مستثنیٰ کی گئی ہیں اور یا یہ کہ اہلِ کتاب میں سے اُن عورتوں کے ساتھ نکاح کر لیا کرو جو موحّد ہوتی ہیں۔ یہ دوسری توجیہہ بہتر ہے۔
- نکاح کے ساتھ ایک نئے گھرانے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ زندگی کے اِس سفر میں ایک دوسرے کے مخلص اور صادق ساتھی رہیں گے۔ اِس لمبے سفر میں اُن کے درمیان فکری وحدت دوسری ہر چیز سے زیادہ اہم اور ضروری ہوتی ہے، خود اُن دونوں کے لئے بھی اور اُن کی اولاد کے لئے بھی۔

زندگی کے اِس ساتھی اور ہمسفر کے انتخاب میں سب سے زیادہ اُس کے ایمان اور عقیدے کو اہمیت دیا کرو تب وہ نہ تو تمہارے ساتھ خیانت کا مرتکب ہو گا نہ تمہارے اولاد کے ساتھ۔ اگر ہمسفر کے انتخاب میں اِس بات کو توجہ نہ دے پاؤ اور مال، جمال اور حسب نسب کی بنیاد پر انتخاب کر بیٹھو تو یا تو یہ ساتھ ادھورا ثابت ہو گا، یا تمہارا گھر تندور بن جائے گا اور یا اِس کا انجام جہنم کی آگ بن جائے گا؛ تمہارے لئے بھی اور تمہارے اولاد کے لئے بھی۔ پیغمبر علیہ السلام کی اِس بارے میں ایک عبرتناک حدیث ہے:

- عن انس بن مالک قال سمعت النبی صلی الله علیه و سلم یقول من تزوج امرأة لعزها لم یزده الله إلا ذلا و من تزوجها لما لها لم یزده الله إلا فقرا و من تزوجها لحسنها لم یزده الله إلا دناءة و من تزوج امرأة لم یتزوجها إلا لیغض بصره أو لیحصن فرجه أو یصل رحمه بارک الله له فیها و بارک لها فیه۔ رواه الطبرانی

اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، اُنہوں نے فرمایا: جس نے کسی عورت سے اُس کی توقیر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نکاح کیا، اللہ تعالیٰ اُس کے لئے ذلت کے علاوہ کسی چیز میں اضافہ نہیں کرے گا۔ اور جس نے اُس کے مال کی وجہ سے اُس کے ساتھ نکاح کیا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے فقر کے علاوہ کسی چیز میں اضافہ نہیں کرے گا۔ اور جس نے اُس کے حُسن کے وجہ سے اُس کے ساتھ نکاح کیا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لئے دنائت کے علاوہ کسی چیز میں اضافہ نہیں کرے گا اور جس نے کسی عورت سے صرف اِس لئے نکاح کیا کہ اپنی نظریں (گناہ سے) روک لے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنی رشتہ داری کے رابطے مضبوط کرے تو اللہ تعالیٰ اِن دونوں کو ایک دوسرے کے لئے باعث برکت بنادے گا۔

عن أبی هریرة عن النبی صلی الله علیه و سلم قال تنکح المرأة لأربع لجمالها و لحسبها و لمالها و لدینها فعلیک بذات الدین۔

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: عورتیں چار خوبیوں کی بدولت نکاح میں لی جاتی ہیں: اُن کی خوبصورتی کی بنیاد پر، حسب نسب کے بنیاد پر، اُن کے مال کی بنیاد پر اور دیانتداری کی بنیاد پر تو تم اُن میں سے زیادہ دیندار کو چُن لیا کرو۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ

ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا۟ حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُم مُّلَٰقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

(۲۲۲)۔ اور حیض کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں، انہیں کہو: یہ ایک تکلیف (کی حالت) ہے پس اپنی بیویوں سے حالتِ حیض میں اجتناب کرو اور اُس وقت تک اُن کے ساتھ قربت نہ کرو جب تک (حیض سے) پاک نہ ہو جائیں۔ لیکن جب پاک ہو جائیں، تو اُس طریقے سے اُن کے ساتھ قربت کرو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور اپنے آپ کو پاک رکھنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (۲۲۳)۔ تمہاری بیویاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں، تو جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ اور اُسے اپنے (مستقبل کے) لئے آگے بڑھاؤ، اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اُس کے حضور پیش ہونا ہے اور مومنوں کو بشارت دے دو۔

(۲۲۲۔۲۲۳)۔ حیض کو اذیت اور بیماری کہا گیا ہے۔ یقیناً یہ خواتین کے لئے ایک اذیت اور بیماری ہی ہے۔ اِس حالت میں اُن کے ساتھ اُس مخصوص قربت کی ممانعت کی گئی ہے، جماع کے علاوہ باقی ہر قسم کی مشروع مباشرت، اٹھنا بیٹھنا اور لیٹ جانا تک جائز ہے۔ حیض سے نکل آنے اور طہارت حاصل ہو جانے کے بعد مباشرت کی اجازت دی گئی ہے مگر چند شرائط رکھی گئی ہیں: اپنی بیویوں کے ساتھ تمہاری قربت ایسی ہونی چاہیے جیسے کاشتکار اپنے کھیتی میں جاتا ہے یعنی فصل اور حاصلات کی غرض اور نیت رکھ کر۔ اِس ہدایت میں ایک طرف نیت اور ہدف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری طرف طبیعی اور انسانی فطرت کے مطابق مباشرت کی طرف۔ اِس طرح اِن مبارک آیات میں مباشرت اور قربت کے ہدف اور مقصد کی نشان دہی کی گئی ہے یعنی یہ کام صرف نفسانی حظ اور جنسی جذبات کی آسودگی کے لئے نہیں ہونا چاہیے بلکہ نکاح کی اصل غرض وغایت اور مقصد اولاد کی پیدائش اور نسل کا دوام ہے۔ اگر یہی مقصد لے کر کوئی اپنے بیوی کے پاس جاتا ہے تو یہ اِس طرح ہے گویا وہ پہلے ہی سے اپنے لئے بہتر ثواب بھیج چکا۔ اسلام انسان کے وہ کام بھی ثواب میں شامل کرتا ہے جو بذاتِ خود تو اُس کے نفسانی تقاضے پورے کرنے ہی کے لئے انجام دیئے گئے ہوں مگر اُن کی پشت پر حلال طریقہ اور اچھی نیت کارفرما ہو۔ اِسی طرح مباشرت کر کے اگرچہ وہ اپنی جنسی ضرورت پوری کرتا ہے لیکن اگر اِسے اچھی نیت اور مشروع طریقہ سے انجام دے تو اللہ کے دین میں ثواب کے قابل گردانا جاتا ہے۔

وَلَا تَجۡعَلُواْ ٱللَّهَ عُرۡضَةٗ لِّأَيۡمَٰنِكُمۡ أَن تَبَرُّواْ وَتَتَّقُواْ وَتُصۡلِحُواْ بَيۡنَ ٱلنَّاسِۚ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٞ ﴿٢٢٤﴾ لَّا يُؤَاخِذُكُمُ ٱللَّهُ بِٱللَّغۡوِ فِيٓ أَيۡمَٰنِكُمۡ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوبُكُمۡۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٞ ﴿٢٢٥﴾

(۲۲۴)۔ اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کے لئے ہدف نہ بناؤ جن کا مقصود نیکی، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی سے باز رہنا ہو اور اللہ خوب جاننے والا سننے والا ہے۔(۲۲۵) اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرتا بلکہ اُن پر گرفت کرتا ہے جن کا تمہارے دلوں نے قصد کیا ہوتا ہے اور اللہ حلیم معاف کرنے والا ہے۔

(۲۲۴۔۲۲۵)۔ اللہ کا نام لے کر ایسی قسمیں نہ کھائیں جو تمہیں نیکی تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کی کوششوں سے روکیں۔ ایسی قسمیں کفارہ ادا کرکے توڑ ڈالنی چاہئیں۔ اللہ تمہاری قسمیں سن چکا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ تم نے کن اور کس طرح کے کاموں کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تمہاری اُن قسموں پر گرفت نہیں کرتا جو لغو اور بے فائدہ ہوتی ہیں۔ جو یونہی ایک تکیہ کلام کے طور پر تمہارے منہ سے نکل جاتی ہیں اور یا بھول کر کسی کام کے بارے میں قسم کھا بیٹھو۔ اور یا مثلاً یوں کہہ دو کہ تمہیں قسم ہے کہ میرے ساتھ جاؤ گے یا یہ کہ بخدا آج تو بارش ہو کر رہے گی اور یہ کہ واللہ سردی بڑھنے لگی ہے۔ یہ اور اِن کی طرح دوسری باتوں پر قسم کھانا اِس لئے لغو اور بے مقصد ہے کہ یہ تمہارے کام ہیں ہی نہیں، اِن کا پورا کرنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تمہاری اُن قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم نے دل میں ارادہ کرکے کھائی ہوں مثلاً آنے والے وقت میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالو اور یا کسی جھوٹی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے قسم کھالو۔ لغو قسموں پر گرفت نہ ہونا اِس لئے ہے کہ اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کے نام پر کھائی گئی ہر قسم پر وہ تمہارا محاسبہ کرتا مگر اِس وجہ سے کہ اللہ حلیم اور بخشنے والا ہے اُس نے تمہیں معاف کر دیا۔

اگر کسی کام کے کرنے کی قسم کھا بیٹھو اور وہ جائز ہو تو اُسے پورا کرو، اگر قسم توڑ دو گے تو کفارہ دینا ہوگا۔ لیکن اگر وہ کوئی ناجائز کام ہے تو اپنی قسم لازماً توڑ ڈالو یا اگر نیک کام نہ کرنے کی قسم کھائی ہے تو قسم توڑ دو اور کفارہ ادا کرو۔ مگر لغو قسم کے لئے نہ کفارہ ہے نہ مواخذہ۔

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا۟ ٱلطَّلَٰقَ فَإِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾

(۲۲۶)۔ جو اپنی بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم کھاتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے چار مہینے تک (لازمی) انتظار کرنا ہے، تو اگر (اس دوران) رجوع کر لیں تو اللہ مہربان بخشنے والا ہے۔ (۲۲۷)۔ اور اگر طلاق کا عزم کر لیا تو اللہ خوب جاننے والا سننے والا ہے۔

(۲۲۶۔۲۲۷)۔ اگر کوئی اپنے بیوی سے قربت نہ کرنے کی قسم کھالے تو چار مہینے سے زیادہ اِس طرح نہیں کر سکتا۔ اِس دوران یا تو طلاق کا فیصلہ کر لے اور یا واپس رجوع کر لے، اِس دوران رجوع نہ کرنا طلاق سمجھا جائے گا۔ ایلاء کی صورت میں امام ابو حنیفہ کی رائے میں چار مہینے گزرنے پر طلاقِ بائن واقع ہو جاتی ہے، دوسروں کی رائے میں طلاق کا فیصلہ قاضی کرے گا۔

اِس حکم سے دو باتیں معلوم ہو جاتی ہیں: پہلی یہ کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ چار مہینے سے زیادہ اپنی بیوی سے علیٰحدہ رہنے کی قسم کھالے۔ دوسری یہ کہ عورتیں اتنی ہی مدت صبر کا حوصلہ اور طاقت رکھتی ہیں۔ اسی بنیاد پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجاہدین کو چار مہینے سے زیادہ محاذ جنگ پر رہنے کا پابند نہیں کرتے تھے۔

وَٱلْمُطَلَّقَٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَٰثَةَ قُرُوٓءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِىٓ أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِى ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا۟ إِصْلَٰحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ ٱلَّذِى عَلَيْهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٨﴾

(۲۲۸)۔ طلاق یافتہ عورتیں اپنے بارے میں تین مرتبہ حیض آنے تک کا عرصہ انتظار کر لیں اور اللہ نے اُن کے رحم میں جو پیدا فرمایا ہے اُسے چھپانا اُن کے لئے جائز نہیں، اگر اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اِس دوران اُن کے شوہر ہر کسی سے زیادہ مناسب اور زیادہ مستحق ہیں کہ اِن کو روک لیں، (بشرطیکہ) اگر اُن کا ارادہ صلح صفائی کرنے کا ہے۔ اِن کے لئے اُن (ہی حقوق) کی مانند (حقوق) ہیں جو (اِن کے شوہروں کے) اِن کے اوپر ہیں لیکن مردوں کو اِن کے اوپر ایک خاص درجہ حاصل ہے اور اللہ باحکمت عزتمند ہے۔

(۲۲۸)۔ طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ حیض آنے تک انتظار کریں گی تا کہ یہ بات یقینی طور پر واضح ہو جائے کہ وہ اُمید سے ہیں یا نہیں۔ انتظار کے اِس عرصے میں سابقہ شوہر سب سے زیادہ اِس قابل اور حقدار ہے کہ اُس کے ساتھ صلح صفائی اور دوبارہ نکاح کر لیا جائے۔ لیکن اِس شرط پر کہ دونوں صلح صفائی کا ارادہ رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔ شوہر کو اِس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اُس کے اپنے بیوی پر جتنے حقوق ہیں بیوی کو بھی اُس کے اوپر اُتنے ہی حقوق حاصل ہیں اور بیوی کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شوہر گھر کا قیم اور مدیر ہے۔ لہٰذا وہ یہ کوشش نہ کرے کہ گھر کی حاکم بن بیٹھے اور شوہر کو اپنا مطیع اور فرمان بردار بنانے کی سعی کرے۔ چھوٹا بڑا ہر ادارہ اور اسی طرح ایک گھر بھی، کسی قیم، رئیس یا ناظم کا محتاج ہوتا ہے۔ مدیر اور قیم کے بغیر معاشرہ اور ادارہ بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام نے یہ ذمہ داری مرد پر ڈال دی ہے اور اِس کے لئے دو دلائل پیش کئے ہیں: پہلی یہ کہ گھر کے سارے اخراجات اُسی کے ذمہ ہوتے ہیں، مہر سے لے کر گھر، کپڑوں اور نان نفقے تک۔ اور دوسری یہ کہ اِس ذمہ داری کے لئے عورت کی نسبت مرد زیادہ مناسب ہے۔ عورت کے جذبات اور عقل کے مابین تعلق اِس طرح ہے کہ اُس کا جذباتی پہلو غالب ہوتا ہے۔ اتنا غالب کہ اکثر عقل کو زیر کر لیتا ہے، اولاد کی تربیت کے لئے اُسے اِسی صفت کی ضرورت تھی اور یہ اِسی طاقتور عاطفے کا کمال ہے کہ وہ اپنی اولاد کی بہبود اور نشو نما کے لئے اپنا آرام و سکون قربان کرتی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس سے مرد حضرات محروم ہوتے ہیں۔ مردوں کا عاطفہ عورتوں کی طرح قوی نہیں ہوتا اور اُن کی عقل اور جذبات کے درمیان ایک اضافی (relative) ربط و تعلق موجود ہوتا ہے۔ قیّمیت اور مدیریّت کے لئے ایسی ہی ایک صفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ اِن دو خصوصیات کی بناء پر اسلام نے مرد کو گھرانے کا قیم مقرر کیا ہے؛ مگر دونوں اور خصوصاً مرد کو اچھے سلوک اور گھر کے تمام اُمور میں مشورے کا مکلف بنایا ہے۔

ٱلطَّلَٰقُ مَرَّتَانِ ۖ فَإِمۡسَاكُۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٍ ۗ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ أَن تَأۡخُذُواْ مِمَّآ ءَاتَيۡتُمُوهُنَّ شَيۡـًٔا إِلَّآ أَن يَخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ ۖ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيمَا ٱفۡتَدَتۡ بِهِۦ ۗ تِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَعۡتَدُوهَا ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ ٱللَّهِ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ

زَوۡجًا غَيۡرَهُۥ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ إِن ظَنَّآ أَن يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ ۗ وَتِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَعۡلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

(٢٢٩)۔ طلاق دو مرتبہ ہے، اُس کے بعد یا تو اچھی طرح رکھنا ہے یا پھر بھلے طریقے سے رخصت کرنا۔ اور تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اُن کو دی گئی چیزوں میں سے کچھ واپس لے لو مگر اُس صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدودِ الٰہی پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ الٰہی حدود کا احترام نہ کر پائیں گے تو پھر اِس میں اُن کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ فدیہ دے (اور طلاق حاصل کرے)۔ یہی الٰہی حدود ہیں تو اِن سے تجاوز نہ کرو اور جس نے الٰہی حدود سے تجاوز کیا؛ وہی ظالم ہیں۔

(٢٣٠)۔ تو اگر (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو پھر تو (اُسے نکاح میں لینا) جائز نہیں، اِلّا یہ کہ اُس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو، پس اگر وہ بھی اُسے طلاق دے دے پھر اِن دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر رجوع کر لیں بشرطیکہ گمان کریں کہ حدود اللہ کا خیال رکھ سکیں گے۔ یہی الٰہی حدود ہیں جنہیں وہ سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے بیان کرتا ہے۔

(٢٢٩۔٢٣٠)۔ اسلامی شریعت نے نکاح اور ایک نئے گھر کی بنیاد رکھنے کے لئے فریقین کے درمیان توافق کو لازم کیا ہوا ہے۔ وہ دونوں کو اچھے سلوک اور ایک دوسرے کے ساتھ مشورے کی وصیت کرتا ہے۔ اختلافات کے حل کے لئے دونوں کو صبر، برداشت اور درگزر کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ اِس طرح سے حل نہ ہو پائے تو دونوں کے رشتہ داروں کو مداخلت کی ہدایت کرتا ہے کہ صلح صفائی کے لئے مل کر کوئی صورت اور ہیئت تلاش کر کے مسئلہ حل کر لیں۔ اگر اِس طرح بھی مسئلہ حل نہ ہو سکے تو شوہر کو طلاق کا حق دیتا ہے مگر وہ بھی اِس تبصرے کے ساتھ کہ: اللہ کے ہاں حلال کاموں میں سے سب سے قابلِ نفرت کام طلاق ہے۔ طلاق کی تشبیہ اُس کڑوی دوائی کے ساتھ دی گئی ہے جو مجبوری میں کوئی ڈاکٹر مریض کے علاج کے لئے تجویز کرتا ہے۔ نکاح اور طلاق کے معاملات میں اسلامی شریعت کی رہنمائیاں ایسی ہیں کہ نتیجتاً میاں بیوی کی مشترک زندگی محبت، نوازش اور احترام کی فضاء میں گزرے اور مجبوری کی صورت میں اُن کی علیٰحدگی بھی اچھی اور باوقار طریقے سے عمل میں آئے۔ ایسے ضوابط مقرر کئے گئے ہیں کہ یہ معاملہ دو گھرانوں کے درمیان قربت کا ذریعہ بنے نہ کہ منافرت اور عداوت کا۔

طلاق کا اختیار مرد کو اور اُس کے مقابل مہر کا حق عورت کو دیا گیا ہے۔ مہر کا تقرر عورت کے مستقبل کے لئے نہایت عمدہ اور حکیمانہ اقدام ہے، تاکہ شوہر بلاوجہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے سکے۔ یا محض اِس وجہ سے کہ اُس کی جوانی ڈھل جائے اور خوبصورتی ماند پڑ جائے تو شوہر اُس سے جان چھڑا کر دوسری جوان اور خوب صورت لے آئے اور یا ویسے ہی دوسری پسند آئے تو پہلی کو طلاق

دے کر دوسری سے بدل ڈالے۔ اِس مقصد کے لئے کہ کوئی عورت کے نصیب سے کھیل نہ سکے، مہر کا حق عورت کو دیا گیا ہے اور اسی لئے شریعت نے مہر کی کوئی حد بھی مقرر نہیں کی تا کہ عورت کے پاس اختیار رہے کہ اپنے مستقبل کی ضمانت کے لئے جتنا کچھ لازمی سمجھے شوہر سے حاصل کرلے۔ اگر شوہر بیوی کو طلاق دینا چاہے تو اُسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اُسے دی گئی چیزوں میں سے، بشمول مہر کے، کچھ واپس لے۔ دوسری طرف اگر بیوی طلاق لینا چاہے تو اُس صورت میں اِس کے لئے تو تیار ہو گی ہی کہ مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دے اور اِس طرح معاملہ حل ہو جائے۔ تیسری مرتبہ طلاق کا مطلب یہ ہے کہ اِن دونوں کے اکٹھے زندگی گزارنے کی کوئی صورت اب نہیں رہی۔ لیکن اگر یہ عورت اب کسی دوسرے سے نکاح کرلے اور یہ دوسرا نکاح بھی طلاق پر منتج ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اِس تلخ تجربے کے نتیجے میں پہلا جوڑا اب اکٹھا رہنے کے لئے تیار ہو چکا ہو۔ لہٰذا اُن کو دوبارہ اِس کام کی اجازت دی گئی ہے مگر اِس شرط پر کہ اگر اپنے آپ میں ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا ارادہ اور ہمت پاتے ہوں۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۟ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُۥ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَايَـٰتِ ٱللَّهِ هُزُوًا ۚ وَٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ ٱلْكِتَـٰبِ وَٱلْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِۦ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

(۲۳۱)۔ اور جب اپنے بیویوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت (کی تکمیل) تک پہنچ جائیں تو یا اُنہیں بھلے طریقے سے رکھ لو اور یا بھلے طریقے سے رخصت کرو اور زیادتی کے ارادے سے اُن کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ اور جو کوئی یہ کام کرے تو یقیناً اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ۔ اور اللہ کی وہ نعمت جس سے اُس نے تمہیں نواز دیا ہے اور کتاب و حکمت میں سے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے جس کے ساتھ تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے؛ اسے یاد کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سب کچھ خوب جانتا ہے۔

---

(۲۳۱)۔ اللہ تعالیٰ نے رجوع کو جائز رکھ کر شوہر اور بیوی کو دوبارہ غور کرنے اور اپنے کئے دھرے پر نظر ثانی کا موقع دیا ہے۔ وقتی علیحدگی کے دوران دونوں غور کر لیں کہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے اثرات خود اُن کے لئے اور اُن کی اولاد کے لئے کتنے دور رس ہیں۔ مبادا اِس رخصت اور جواز سے غلط فائدہ اُٹھاتے ہوئے شوہر اِسے بیوی کو تنگ کرنے کے لئے استعمال کرے؛ ایسے طرزِ عمل کو اللہ نے اپنی آیات کا مذاق اُڑانے اور خود اپنی جان پر ظلم کرنے کے مترادف قرار دیا ہے اور اِسے اُس نعمت کی ناشکری

قرار دیا ہے جو کتاب اور حکمت کی صورت میں مسلمانوں کے شامل حال کی گئی ہے۔اِن کو خبر دار رہنا چاہیے کہ اِن کا معاملہ اُس علیم خدا کے ساتھ ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور اِن کی کوئی چیز اُس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَٰجَهُنَّ إِذَا تَرَٰضَوْا۟ بَيْنَهُم بِٱلْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِۦ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

(۲۳۲)۔اور جب اپنی بیویوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت مکمل کر لیں تو اُنہیں اپنی مرضی کے شوہر کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو اگر وہ بھلے طریقے سے آپس میں راضی ہوں۔ یہ آپ میں سے اُس شخص کے لئے نصیحت ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور پاکی اور تزکیہ کا باعث ہے۔اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

---

(۲۳۲)۔طلاق یافتہ عورتوں کو اپنی پسند کے مرد کے ساتھ نکاح سے نہ روکیں، چاہے وہ اُس کا سابقہ شوہر ہو یا کوئی دوسرا شخص۔ نہ گھر کے دوسرے افراد کو اِس طرح کرنا چاہیے اور نہ سابقہ شوہر کو۔ معاشرے میں اخلاقی فساد کی روک تھام کے لئے یہی طریقہ سب سے بہتر ہے کہ اِن بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے شوہروں سے نکاح کرنے دیا جائے۔زبردستی کا نکاح اور اپنی مرضی کے شوہر سے نکاح میں رکاوٹ ڈالنا معاشرے میں فساد کا باعث بنتا ہے۔

اسلام نے ایک طرف بیواؤں کے والی وارثوں کو ہدایت کی ہے کہ بیواؤں کو اپنی پسند کے شوہروں کے ساتھ نکاح سے نہ روکیں لیکن دوسری طرف عورتوں کو اِس کا مکلف بنایا ہے کہ نکاح کے بارے میں اپنے ولی کی مرضی کا خیال رکھیں۔ یہ اِس لئے کہ نکاح دو گھرانوں کے مابین قربت کا ذریعہ بن جائے نہ کہ دشمنی اور نفرت کا باعث۔

اِس بارے میں دو بنیادی باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

- عورت کے اولیاء کو اپنی مرضی اُن پر ٹھونسنی نہیں چاہیے اور اُنہیں بے مقصد تنگ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اُنہیں چھوڑ دینا چاہیے کہ اپنی مرضی کے مرد سے نکاح کر لیں۔ یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کا تقاضا بھی ہے اور اخلاقی فساد کی راہ روکنے کا ذریعہ بھی۔

- عورت کو یہ کام چھپ کر اور اولیاء کی بے خبری میں نہیں کرنا چاہیے۔ اِس لئے کہ اِس سے فتنے جنم لیتے ہیں اور دونوں گھرانوں کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہے۔

درج ذیل دو احادیث اسی حقیقت کی توضیح کرتی ہیں:

روی أن معقل بن یسار کانت أختہ تحت أبی البداح فطلقها و ترکها حتی انقضت عدتها۔ ثم ندم فخطبها فرضیت و أبی أخوها أن یزوّجها و قال: وجهی من وجهک حرام إن تزوجتیه۔ فنزلت الأیة۔ قال مقاتل: فدعا رسول الله صلی الله علیه و سلم معقلا فقال: إن کنت مؤمنا فلا تمنع أختک عن ابی البداح فقال: آمنت بالله ، و زوجها منه۔ رواه البخاری

روایت ہے کہ معقل بن یسار کی بہن ابی البداح کے نکاح میں تھی، اُس نے طلاق دے دی۔ عدت گزر گئی تو وہ اپنے کیے پر نادم ہوا اور دوبارہ نکاح کا پیغام دیا۔ وہ بھی راضی ہو گئی مگر بھائی نے اِس نکاح کی مخالفت کی اور اپنی بہن سے کہا: کہ اگر دوبارہ اِس کے ساتھ نکاح کر لیا تو میرا تم سے ملنا جلنا حرام ہے۔ یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر علیہ السلام نے معقل کو بلایا اور اُسے کہا: اگر مومن ہو تو اپنی بہن کو ابی البداح کے ساتھ نکاح سے منع مت کرو۔ اُس نے کہا کہ میرا اللہ پر ایمان ہے۔ تو اُسے نکاح میں دے دیا۔

عن عائشةَ زوج النبی صلی الله علیه و سلم، عن رسول الله صلی الله علیه و سلم أَیَما امرأة نکحت بغیر إذن و لیها۔ فنکاحها باطل، فنکاحها باطل --------

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اپنے ولی کے اجازت کے بغیر نکاح کرلے تو اُس کا نکاح باطل ہے، اُس کا نکاح باطل ہے-----

اس بات پر اُن لوگوں کا اعتراض بہت بے بنیاد اور غلط ہے جو کہتے ہیں کہ ولی کی رضامندی عورت کے بشری حقوق کی خلاف ورزی ہے!! وہ جانتے نہیں کہ یہ موافقت کتنی اہمیت کی حامل ہے اور اُس کا عدم التزام کتنے مسائل کھڑے کر دیتا ہے۔ جتنی ماں باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے، اپنے تجربات کی روشنی میں اُس کی جس طرح درست رہنمائی وہ کرسکتے ہیں اور اُس کو ٹھیک مشورہ دے سکتے ہیں اتنا وہ خود کہاں کر سکتی ہے۔ اُس کو نہ تو ماں باپ کے بقدر تجربہ حاصل ہوتا ہے اور نہ معرفت۔ بارہا ایسے ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کی بنیاد پر فیصلہ کر بیٹھتی ہے اور کسی کی خوبصورتی، لباس اور ظاہری وضع قطع اُسے اپنے گرفت میں لے کر اُسے جذباتی فیصلے کی جانب لے جاتی ہے۔ لیکن ماں باپ اُس کے دوسرے لاتعداد پہلو بھی ذہن میں رکھتے ہیں اور اپنی بیٹی کے مستقبل اور بہبود کی درست اور بامعنی فکر کرتے ہیں۔

اِس صورت میں کہ اسلام عورت کی رضامندی کو نکاح کی بنیادی شرط قرار دیئے ہوئے ہے؛ ایسے بے بنیاد اعتراض کی کیا مجال باقی رہ جاتی ہے۔ یہ دانشمند حضرات اِس پر تو تیار نہیں کہ اِن کی بکری کسی کے بکرے کے ساتھ اپنی مرضی سے چلی جائے؛ دوسرے کو کس طرح کہتے ہیں کہ تمہاری بیٹی تمہیں بتائے بغیر کسی ایسے شخص کے ساتھ اپنی مرضی اور اختیار سے چلی جائے جس کو وہ اُس کے لئے نامناسب سمجھتا ہے۔

وَٱلۡوَٰلِدَٰتُ يُرۡضِعۡنَ أَوۡلَٰدَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِۖ لِمَنۡ أَرَادَ أَن يُتِمَّ ٱلرَّضَاعَةَۚ وَعَلَى ٱلۡمَوۡلُودِ لَهُۥ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِۚ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ إِلَّا وُسۡعَهَاۚ لَا تُضَآرَّ وَٰلِدَةُۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوۡلُودٞ لَّهُۥ بِوَلَدِهِۦۚ وَعَلَى ٱلۡوَارِثِ مِثۡلُ ذَٰلِكَۗ فَإِنۡ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٖ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۗ وَإِنۡ أَرَدتُّمۡ أَن تَسۡتَرۡضِعُوٓاْ أَوۡلَٰدَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا سَلَّمۡتُم مَّآ ءَاتَيۡتُم بِٱلۡمَعۡرُوفِۗ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ (۲۳۳)

(۲۳۳)۔ اور اگر کوئی چاہتا ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت مکمل ہو تو مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال تک دودھ پلائیں اور بچے کے باپ پر اُس کی حیثیت کے مطابق اُن کی خوراک اور کپڑوں کی ذمہ داری ہے۔ اور کسی کو بھی اُس کے بس سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ماں کو اُس کی اولاد کی آڑ میں تکلیف میں ڈالا جائے اور نہ باپ کو اُس کی اولاد کے بہانے۔ اور وارث کے لئے بھی اِسی کی مانند (حقوق و فرائض) ہیں۔ اور اگر دونوں اپنی خوشی اور مرضی سے آپس میں مشورہ کر کے دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر اولاد کے لئے دائی رکھنا چاہیں تو بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ طے شدہ مزدوری اچھے طریقے سے ادا کریں۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تمہارے کئے دھرے کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔

(۲۳۳)۔ طلاق کے بعد بھی میاں بیوی کو مکلف کیا گیا ہے کہ اپنے دودھ پیتے بچے کے بارے میں مشورہ کریں۔ اِس دوران ماں دودھ پلائے گی اور باپ اُس کے نان نفقے کی ذمہ داری سنبھالے گا۔ مگر نہ ماں کو بچے کی آڑ میں تکلیف دی جائے گی اور نہ باپ کو، اگر باپ نہ ہو تو یہی ذمہ داری ورثاء پر عائد ہوتی ہے۔ دودھ پلانے کا کُل عرصہ دو سال ہے لیکن اگر ماں باپ چاہیں کہ کسی ضرورت یا مصلحت کی بناء پر اِس میں تخفیف کریں تو اُن کو اجازت ہے۔ مگر اُس کے لئے دو شرائط ہیں: اِس میں دونوں کی مرضی شامل ہو اور آپس میں مشورہ کر چکے ہوں۔ مشورہ اور فریقین کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ کریں اسلام نے خانگی معاملات میں میاں اور بیوی کو مکلف کیا ہے کہ ہر کام مشورہ اور طرفین کی رضامندی اور موافقت سے انجام دیا جائے۔ اِس آیت سے اسلام کی نظر میں مشورے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مشورے سے وہ نتیجہ بر آمد کرنا مقصود ہوتا ہے جس میں فریقین کی رضا اور موافقت شامل ہو۔ مشورہ یہ نہیں ہے کہ ایک فریق دوسرے سے فقط رائے اور نکتۂ نظر دریافت کرے اور آخری فیصلہ وہ خود کرے۔ مشورہ دوسرے کی فقط رائے جاننے کے لئے نہیں ہوتا۔ ایسے مشورے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جس میں ایک

شخص دوسروں کی رائے سن لیتا ہے مگر فیصلہ وہ خود اور دوسروں کی رضا اور موافقت سے بالاتر ہو کر کرتا ہے۔ مشورہ اُسے کہا جاتا ہے کہ جس سے بحث و تفاہم کے نتیجے میں طرفین کی پسند کا وہ فیصلہ برآمد ہو جس پر دونوں راضی اور متفق ہوں۔ بعض لوگ مشورے کی ایسی تعبیر پیش کرتے ہیں جو جباروں اور ڈکٹیٹروں کو بہت پسند ہے۔ امیر اور زعیم کو حق دیتے ہیں کہ دوسروں کی بات سنے مگر آخری فیصلے کا حق اُسے ہی حاصل ہوتا ہے؛ یہ مبارک آیت اِس غلط تعبیر کی بیخ کنی کرتی ہے۔ اگر باپ اِس بات کا مکلف ہے کہ اپنے بچے کو دودھ پلانے کے معاملے میں اپنی بیوی سے مشورہ کرے اور فیصلہ دونوں کی رضا اور موافقت سے قرار پائے گا تو امیر کو کہاں سے یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ عوام کی ملکیت اور اُن سے متعلق امور کا خود سرانہ اور دوسروں کے مشورے اور رضامندی کے بغیر فیصلہ کرے؟ معاشرے میں اُس کی حیثیت اور مقام کسی صورت اُس سے بالاتر نہیں ہے جو باپ اور شوہر کا اپنے گھر میں ہے۔ اسلام تو اُس کو بجائے قیم کے خلیفہ اور امین کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ تو عوام کی امانتوں کا امین ہے اور اُسے کسی بھی امانت میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق نہیں دیا گیا۔ اُس کی حیثیت اتنی ہی ہے جتنی جمعہ کے نماز میں امام کی۔

وَٱلَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَٰجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾

(۲۳۴)۔ اور تم میں سے جو مر جائیں اور (اپنے پیچھے) بیوائیں چھوڑ جائیں، یہ بیوائیں چار مہینے اور دس دن اپنے بارے میں انتظار کر لیں۔ تو جب یہ مدت پوری ہو تو پھر اپنے بارے میں بھلے طریقے سے جو بھی کر لیں اُس میں تمہارے اوپر کوئی گناہ لازم نہیں آتا اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

---

(۲۳۴)۔ بتکرار یہ بات کرنے سے، کہ بیواؤں کو اجازت ہے کہ شریعت اور معاشرے کے معروف اور بھلے رسم و رواج کے مطابق اپنے بارے میں اور اپنے لئے شوہر کے انتخاب کے بارے میں فیصلہ کر لیں؛ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختیار مکمل طور پر بیواؤں کو دیا گیا ہے۔ اُن کے اپنے گھر والوں کو بھی اُن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے اور سسرال کو بھی۔ کوئی بھی اُن پر اپنی مرضی مسلط نہ کرے۔ ایسی زبردستی فائدے کے بجائے نقصان کی حامل ہوتی ہے اور فساد اور فتنوں کی راہ ہموار کرتی ہے۔ میکہ اور سسرال دونوں کو اِس میں عار کا کوئی پہلو نظر نہیں آنا چاہیے اور اِسے جرم کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيمَا عَرَّضۡتُم بِهِۦ مِنۡ خِطۡبَةِ ٱلنِّسَآءِ أَوۡ أَكۡنَنتُمۡ فِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّآ أَن تَقُولُواْ قَوۡلٗا مَّعۡرُوفٗاۚ وَلَا تَعۡزِمُواْ عُقۡدَةَ ٱلنِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡكِتَٰبُ أَجَلَهُۥۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ فَٱحۡذَرُوهُۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٞ ﴿۲۳۵﴾

(۲۳۵)۔ اور اِن عورتوں کے رشتے (نکاح کرنے) کے بارے میں اگر آپ کچھ ظاہر کریں یا دل میں رکھیں، تو اِس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ آپ ضرور اِسے ظاہر کریں گے، مگر چھپا کر وعدے نہ کریں ہاں اگر کوئی بات کرنی ہے تو وہ معروف طریقے سے کریں اور اُس وقت تک نکاح کا فیصلہ نہ کریں جب تک کہ مقررہ مدت (عدت) پوری نہ ہو جائے۔ اور جان لو کہ اللہ آپ کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے پس اُس سے ڈریں۔ اور جان لیں کہ اللہ حلیم معاف کرنے والا ہے۔

(۲۳۵)۔ اُن بیواؤں کے نکاح کا بھی ارادہ کر سکتے ہو جن کی ابھی عدت پوری نہیں ہوئی۔ اپنا ارادہ اشاروں اور مجمل الفاظ میں بیان بھی کر سکتے ہو مگر بھلے طریقے سے اور مناسب الفاظ میں۔ اِس وقت اُن کو نکاح کے بارے میں صریح الفاظ میں واضح باتیں پہنچانا منع ہے اِس لئے کہ اس موقع پر اِیسی باتوں سے فتنے میں پڑ جانے کا احتمال ہے۔ اپنے آپ کو بھی فتنہ میں نہ ڈالیں اور اُن کو بھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری کمزوریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اِس وجہ سے کہ وہ حلیم اور بُردبار معاف کرنے والا ہے؛ یہ اجازت دی ہوئی ہے مگر یہ اجازت آپ کے گناہ میں پڑ جانے کا سبب نہ بننے پائے۔ اِس بات کو یاد رکھیں کہ وہ تمہارے دلوں کے اسرار سے باخبر ہے لہٰذا احتیاط کریں۔

لَّا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ إِن طَلَّقۡتُمُ ٱلنِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ أَوۡ تَفۡرِضُواْ لَهُنَّ فَرِيضَةٗۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى ٱلۡمُوسِعِ قَدَرُهُۥ وَعَلَى ٱلۡمُقۡتِرِ قَدَرُهُۥ مَتَٰعَۢا بِٱلۡمَعۡرُوفِۖ حَقًّا عَلَى ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِن طَلَّقۡتُمُوهُنَّ مِن قَبۡلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيضَةٗ فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ إِلَّآ أَن يَعۡفُونَ أَوۡ يَعۡفُوَاْ ٱلَّذِي بِيَدِهِۦ عُقۡدَةُ ٱلنِّكَاحِۚ وَأَن تَعۡفُوٓاْ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۚ وَلَا تَنسَوُاْ ٱلۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

(۲۳۶)۔اِس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورتوں کو قربت سے پہلے اور یا اُن کا کوئی مہر مقرر کرنے سے قبل طلاق دے دو۔ مگر کچھ مال متاع (ضرور) دے دو، مالدار اپنے حیثیت کے مطابق اور نادار اپنے بس کے مطابق، مناسب متاع اور بھلے طریقے سے، یہ محسنین کے اوپر ایک حق ہے۔(۲۳۷)۔ اور اگر قربت سے قبل اُس وقت طلاق دو کہ مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو اُس کا آدھا ادا کر دو، ہاں اگر وہ عورت معاف کر دے (تو پھر اور بات ہے)، اور یا وہ شخص جس کی مُٹھی میں نکاح کا مال ہے (اپنا حصہ) چھوڑ دے۔ اور اگر عفو سے کام لو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کا فضل و احسان بھول نہ جایا کرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔

(۲۳۶۔۲۳۷)۔اگر قربت اور خلوتِ صحیحہ سے قبل اور ایسے وقت عورتوں کو طلاق دے دو کہ ابھی اُن کا مہر مقرر نہیں کیا ہے تو اِس صورت میں نہ گناہ ہوتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کے مکلف قرار پاتے ہو۔ مگر اپنی حیثیت کے مطابق اِن عورتوں کو بھی کچھ مال دیا کرو، اِس طرح دونوں گھرانوں کے مابین کھچاؤ اور تلخی کی فضا کم ہو جائے گی اور اُس خاتون کی کچھ تسلی بھی ہو جائے گی۔ لیکن اگر مہر مقرر ہو چکا ہے تو پھر اُس مقرر شدہ مہر کا آدھا ادا کرنا لازم ہے۔ ہاں اگر وہ عورت درگزر کر لے یا وہ مرد بقیہ آدھا بھی ادا کر دے۔ یہی ایک دوسرے کے حق میں عفو، اپنے حق سے دوسرے کے لئے دستبرداری اور فضل و احسان کا رویہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

حَٰفِظُواْ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلۡوُسۡطَىٰ وَقُومُواْ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ ﴿٢٣٨﴾ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا أَوۡ رُكۡبَانًاۖ فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾

(۲۳۸)۔ تمام نمازوں اور اُن میں سے اُس منتخب (حسن) کی خوب حفاظت کرو اور اللہ کے لئے قانت (سرِ تسلیم خم کرنے والے اور منقاد) کھڑے رہو۔ (۲۳۹)۔ اگر خوف کا عالم ہو تو پھر پیادہ یا سوار مگر جب امن کا احساس ہو جائے تو پھر اللہ کو اُسی طرح یاد کرو جس طرح اُس نے سکھایا ہے، وہ کچھ جو تم نہیں جانتے تھے۔

(۲۳۸۔۲۳۹)۔ الصلواۃ الوسطیٰ سے مراد وہ نماز ہے جس کی ہر پہلو سے مکمل نگہداشت کی گئی ہو۔ ایسی نماز جو قنوت، خشوع، خضوع اور دل و حواس کی مکمل حضوری کے ساتھ ادا کی گئی ہو، خطر اور سفر کے دوران ایسی نماز ادا نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے اللہ فرماتا ہے کہ خطرے کے وقت اجازت ہے کہ چلتے چلتے، چاہے سوار ہوں یا پیدل، نماز ادا کرو۔ اِس طرح اشارے کے ساتھ، اصل نماز کا نصف، قبلے کا اہتمام کئے بغیر، قرأت اور تسبیحات کے اختصار کے ساتھ جتنے کا موقع ملے، نماز ادا کرو۔ لیکن

امن کی حالت میں اُسی طریقے سے نماز کا اہتمام کرو جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے۔ یہاں وسطیٰ اُنہی معنوں میں آیا ہے جن میں اسی سورت کی آیت ۱۴۳ میں آیا ہے: وَ كَذٰلِکَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسطاً: جس طرح یہاں وسطاً سے زمانی اور مکانی وسط مراد نہیں ہے اسی طرح الصلواۃ الوسطی سے بھی وہ نماز مراد نہیں ہے جو اوقاتِ نماز کے لحاظ سے دوسرے نمازوں کے درمیان میں پڑتی ہو۔ آیت کا آخری حصہ نہایت صراحت کے ساتھ اِس مطلب کی نشاندہی کرتا ہے کہ الصلواۃ الوسطیٰ سے خوب تر (احسان کے ساتھ) نماز مراد ہے وہی جو خطر اور سفر کی حالت میں ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اِس سے عصر کی نماز مراد لینا پوری آیت اور خصوصاً اِس کے آخری حصے سے مطابقت نہیں رکھتا۔

تاہم یہ بات کہ یہاں نماز کا ذکر اُس بحث کے درمیان میں کیوں لایا گیا ہے جو گھر گرہستی سے متعلق ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ نماز تمام خوبیوں کا سرچشمہ اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصلاح کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اِسی نماز کے بدولت انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بھی استوار ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ بھی۔ انسان انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں داخل ہوتا ہے اور ہر روز دوسروں کے ہمراہ ایک ہی صف میں اکٹھے اللہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ یوں وہ اللہ کی بندگی اور اطاعت اور آپس میں برابری اور اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انسانی معاشرے کی بیشتر مشکلات خود پسندی، انفرادیت اور دوسروں کی نسبت برتری اور بڑائی کے احساس سے جنم لیتی ہیں۔ نماز ان سب ناپسندیدگیوں کا علاج ہے اِسی لئے مختلف مسائل پر بحث کے دوران درمیان میں جگہ جگہ نماز کا ذکر آتا ہے۔

وَٱلَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَٰجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَٰجِهِم مَّتَٰعًا إِلَى ٱلْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِى مَا فَعَلْنَ فِىٓ أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَٰتِ مَتَٰعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾

(۲۴۰)۔ اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیوائیں چھوڑ جائیں اُن پر اپنی بیویوں کو پورے ایک سال تک نہ نکالنے کی وصیت لازم ہے۔ پھر اگر وہ خود نکلیں تو اپنی ذات کے حوالے سے معروف طریقے سے وہ جو کام کریں تو تم پر اُس کا کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ باحکمت عزتمند ہے۔ (۲۴۱)۔ اور مطلقہ عورتوں کو بھلے طریقے سے کچھ مال متاع دینا متقین پر لازم ہے۔ (۲۴۲)۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات تمہارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھ بوجھ (تعقل) سے کام لو۔

(۲۴۰)۔ اِس آیت کے بارے میں صحابہ کے درمیان بھی دو آراء ملتی ہیں اور اُن کے بعد، مفسرین کے مابین بھی۔ بعض اِسے منسوخ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ میراث کے تعین سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ جب میراث کے احکام میں شوہر کے مال میں بیوی کا حصہ مقرر کیا گیا اور عدت کے عرصے کا بھی تعین کیا گیا تو اُس کے بعد عورت کو اُس کی مرضی کے لئے آزاد چھوڑا گیا ہے اور میت کے ورثاء اُس کے گھر اور نان نفقہ کے مکلف نہیں رہے۔ جبکہ بعض اس نکتۂ نظر کے مطابق کہ چونکہ یہاں عدت کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے؛ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ اُس گھر میں اپنی زوجہ کی اقامت کی ضرورت محسوس کرے جو میراث میں اُس کو ملنے والا نہیں ہے تو ایک سال تک اُس گھر سے اُسے نہ نکالنے کی وصیت کر سکتا ہے۔ آیت کے الفاظ سے اِس رائے کی تائید ہوتی ہے۔

(۲۴۱۔۲۴۲)۔ اسلام کی نظر میں خاندان معاشرے کی مجموعی ہیٔت کے لئے بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گھر کا مقام معاشرے کے وسیع محل کی تعمیر میں اینٹ کا سا ہے اور اسلام گھر اور خاندان کا بگاڑ معاشرے کے ہر بگاڑ کی بنیاد سمجھتا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں: شیطان دوسرے ہر کام سے زیادہ اِس سے خوش ہوتا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان ایسی ناچاقی پیدا ہو جائے جو گھرانے کے درہم برہم ہونے پر منتج ہو جائے۔ وہ (شیطان) جب فتنے کھڑے کرنے کے لئے اپنے لشکر مختلف سمتوں میں روانہ کرتا ہے تو اُن میں سے بعض خونریزی پر اُبھارتے ہیں، بعض چوری، شراب، زنا اور دوسرے گناہوں کی طرف لوگوں کو لے جاتے ہیں مگر ابلیس دوسرے ہر ایک سے زیادہ اپنے اُس کارندے کی شرارت پر خوش ہوتا ہے جو میاں بیوی کو آپس میں جدا کر کے ایک گھرانے کو تباہ کر آیا ہوتا ہے اور اُسی کو کمر پر تھپکی دے کر شاباش دیتا ہے۔ ملاحظہ کریں قرآن عائلی اور خاندانی زندگی کے مختلف مسائل پر کتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ بحث کرتا ہے اور کس طرح تمام مسائل کے بارے میں واضح اور دوٹوک رہنمائیاں دیتا ہے۔

یہاں گھریلو زندگی کے بارے میں بحث اختتام کو پہنچتی ہے اور دوسرا باب شروع ہوتا ہے جس میں جہاد سے متعلق مسائل چھیڑے گئے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ خَرَجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ ٱللَّهُ مُوتُوا۟ ثُمَّ أَحْيَـٰهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلنَّاسِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾

(۲۴۳)۔ کیا تم نے اُن لوگوں پر غور نہیں کیا جو اِس حال میں موت کے خوف سے اپنے گھروں سے نکلے کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، تو اللہ نے اُن سے فرمایا کہ: مر جاؤ، مگر پھر اُن کو زندہ کیا۔ یقیناً اللہ لوگوں کو بڑے فضل سے نوازنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

---

(۲۴۳)۔ یہاں اُس قوم پر گرفت کی گئی ہے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ تھی اُن کی گنتی ہزاروں تک پہنچتی تھی مگر پھر بھی موت کے خوف سے اپنا گھر بار دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اُن کا یہ فرار اُن کو موت سے نہ بچا سکا، بلکہ اِس کے برعکس اِس بزدل قوم کو اللہ نے موت ہی سے ہمکنار کیا۔ موت سے ڈرنے والی قوم کا انجام موت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس قوم کی موت کا فیصلہ کر دیتا ہے جو موت کے خوف سے ملک دشمن کے حوالے کر کے بھاگ جائے جبکہ حال یہ ہو کہ اُن کی تعداد بھی اچھی خاصی بڑھی ہوئی ہو۔ خبردار! کہیں تم اُس بزدل قوم کی مانند دشمن کے مقابلے سے بھاگ نہ جانا اور اللہ کے ہاں موت کے حقدار نہ ٹھہر جانا۔ ایک چھوٹے سے گروہ یا چند محدود لوگوں کے لئے تو پھر بھی اِس طرح فرار کا کوئی جواز بن سکتا ہے مگر ایک پوری قوم اور ایک ایسا گروہ جس کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہو، کے لئے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اللہ جل شانہ اپنے بندوں پر فضل کا مالک ہے، اور یہ اِسی فضل کا نتیجہ ہے کہ اِس حالت میں اُن کو دوبارہ مہلت دے دیتا ہے جب وہ دائمی موت کے مستحق ہوتے ہیں۔

وَقَـٰتِلُواْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَّن ذَا ٱلَّذِى يُقْرِضُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَـٰعِفَهُۥ لَهُۥٓ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَٱللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾

(۲۴۴)۔ اور اللہ کی راہ میں لڑو اور یہ جان لو کہ بے شک اللہ خوب جاننے والا سننے والا ہے۔(۲۴۵)۔(تم میں سے) کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے جسے اللہ اُس کے لئے کئی گنا بڑھا دے۔ اور یہ تو اللہ ہی ہے جو تنگی اور کشادگی پیدا کرتا ہے اور اُسی کی طرف دوبارہ پھیرے جاؤ گے۔

---

(۲۴۴)۔ جنگ کے بارے میں جو تم کہتے ہو اور جو کرتے ہو اللہ اُسے جانتا ہے۔(۲۴۵)۔ یہاں اور متعدد دوسری آیات میں بھی اللہ کی راہ میں جانی اور مالی قربانی اِس طرح برتی گئی ہے جیسے کوئی اللہ کو قرض دے دے۔ اللہ اِس قرض کا کئی گنا بدلہ دے دے گا۔ اللہ کی راہ میں وقف کردہ مال کو اللہ کئی کئی گنا بڑھا دے گا یہ اِس لئے کہ بڑھانا اور گھٹانا تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلْمَلَإِ مِنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ مِنۢ بَعْدِ مُوسَىٰٓ إِذْ قَالُوا۟ لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ٱبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِتَالُ أَلَّا تُقَٰتِلُوا۟ ۖ قَالُوا۟ وَمَا لَنَآ أَلَّا نُقَٰتِلَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَٰرِنَا وَأَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ ٱلْقِتَالُ تَوَلَّوْا۟ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ٱللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا۟ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ ٱلْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِٱلْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ ٱلْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُۥ بَسْطَةً فِى ٱلْعِلْمِ وَٱلْجِسْمِ ۖ وَٱللَّهُ يُؤْتِى مُلْكَهُۥ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

(۲۴۶)۔ کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے اُن سرداروں کو نہیں دیکھا، جنہوں نے اپنے پیغمبر کو کہا: ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اُس نے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر لڑائی فرض ہو جائے اور تم نہ لڑو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں نہیں لڑیں گے، اس حال میں کہ ہم اپنے گھر بار سے اور خاندان سے نکالے گئے ہیں؟ مگر جب اُن پر جنگ کرنا فرض ہو گیا تو ایک قلیل تعداد کے علاوہ سب نے منہ موڑ لیا اور اللہ تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۲۴۷)۔ اور اُن کے پیغمبر نے اُنہیں کہا: اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا: وہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے اور بادشاہی کے لئے ہم اُس سے زیادہ موزوں اور مستحق ہیں اور اُسے مالی آسودگی بھی حاصل نہیں؟ اُس نے کہا کہ: بے شک اللہ نے اُسے تم پر فوقیت دی ہے اور اُسے علم اور جسم میں وسعت اور فراوانی دی ہے۔ اور اللہ جس کو چاہے بادشاہی دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

---

(۲۴۶)۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور اُس وقت جب بنی اسرائیل شرک اور فساد میں غرق تھے اور راہ راست سے منحرف ہو گئے تھے تو جالوت نامی ایک ظالم اور بے رحم بادشاہ اُن پر مسلط ہوا۔ اُن میں سے لاتعداد کو مار ڈالا، اُن کے گھروں کو لوٹ کر تاراج کیا اور اُن کو اُن کے گھروں سے مار مار کر بے دخل کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ اُن کے اندر رہنمائی کے لئے اشموئیل نبی موجود تھے۔ یہ لوگ آپؑ کے پاس آئے، اپنے پچھلے کئے کرائے اور جہاد نہ کرنے پر ندامت کا اظہار کیا اور آپؑ سے اللہ کی راہ میں جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ علیہ السلام نے اُن کے ماضی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُنہیں کہا: مبادا جہاد تم پر فرض ہو جائے اور تم

پہلو تہی کر بیٹھو۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ اِس حال میں کہ ہم پر ظلم توڑے گئے ہیں اور گھر بار سے نکالے گئے ہیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں۔ مگر جب اُنہیں کہا گیا کہ ٹھیک ہے اب اسلحہ اُٹھائیں اور دشمن سے لڑیں تو چند محدود لوگ ہی تیار ہوئے۔ باقی تمام اپنے وعدوں اور اللہ کی راہ میں لڑنے سے پھر گئے۔ اللہ کے پیغمبر نے کہا تم نے ایک بادشاہ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ منتخب کیا ہے۔ اللہ سے پھری ہوئی قوم نے کہا: یہ ہماری قیادت کے قابل نہیں ہے، نہ اپنے نسب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت کے لحاظ سے۔ تمام اُمت کی قیادت تو کسی ایسے شخص کے حوالے ہونی چاہیے جسے قیادت و زعامت اپنے باپ دادا سے میراث میں ملی ہو۔ کسی معتبر اور بالاتر خاندان کا چشم و چراغ ہو اور بہت سا مال و دولت رکھتا ہو!! پیغمبر اُن کے جواب میں کہتا ہے: اِسے تو اللہ نے پسند کیا ہے، قیادت و زعامت کی اہلیت اُسی نے دی ہے، خوب دانا ہے اور بہترین صحت اور طاقتور بدن کا مالک ہے۔ قیادت کے لئے بہتر صفات تو یہی ہیں مگر وہ طالوت کی قیادت ماننے پر تیار نہیں تھے۔ اُن کے معیارات بدل گئے تھے قیادت کی اہلیت اور صفات کے بارے میں اُن کے خیالات ویسے ہی تھے جیسے ایک بے دین اور گمراہ قوم کے ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ اِن کی طرح نہیں ہے کہ نسب اور مال کو قیادت کے لئے اہلیت کا پیمانہ قرار دے اور طالوت کی طرح ایک نادار اور بے نام و نشان کو اُن کی قیادت کے لئے نااہل قرار دے۔ اِس پر وہ پیغمبر سے ثبوت کے طلبگار ہوئے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهِۦٓ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلتَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسَىٰ وَءَالُ هَـٰرُونَ تَحْمِلُهُ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَـَٔايَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

(۲۴۸)۔ اُن کے پیغمبر نے اُنہیں کہا: اِس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے ایک تسلی اور موسیٰ اور ہارون کی اولاد کا ترکہ ہے، اُس کا بوجھ فرشتے اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم مومن ہو تو اِس میں تمہارے لئے کھلی نشانی ہے۔

---

(۲۴۸)۔ بنی اسرائیل میں اُن کے باپ دادا سے ترکہ میں ایک ایسا صندوق چلا آرہا تھا جس میں کچھ قدیم نوادرات اور تبرکات مثلاً تورات کی تختیاں اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ہاتھ کی نشانیاں تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک یہ صندوق اُن کے قبضے میں رہے گا وہ بالادست رہیں گے اور دشمن اُن پر غلبہ نہیں پا سکے گا۔ مگر اُن کے ملک پر فوج کشیوں کے دوران یہ صندوق

دشمن کے ہاتھ لگ گیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُن کی باقی ماندہ ہمت وجرأت بھی جواب دے گئی، دشمن کے مقابلے سے دست بردار ہوئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں پر اُن کے پیغمبر نے اُنہیں کہا کہ یہ صندوق اللہ دوبارہ تمہارے قبضے میں دے دے گا، فرشتے اُسے تمہارے پاس لے آئیں گے اور یہ تمہارے لئے اِس بات کی نشانی ہو گی کہ طالوت کی تقرری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اِس قصے کے تناظر میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو بتانا چاہتا ہے کہ مبادا جہاد کی فرضیت کے بعد پیچھے ہٹ جاؤ یا قیادت کے لئے وہ معیارات مقرر کرلو جو جاہل قوموں کا وطیرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ علمی استعدادات اور جسمانی تندرستی اور طاقت کے علاوہ دوسرے معیارات کی روسے اپنے لئے قیادت کا انتخاب کرنے لگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اُن لوگوں کے ساتھ مخالفت کی راہ پر چل نکلو جن کو اللہ تعالیٰ نے قیادت کی بہتر صفات سے نوازا ہے۔ آدم علیہ السلام کی خلافت کے ذکر میں بھی آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی علمی استعداد اور ہر چیز کو پہچان کر اُسے ایک مناسب نام دینے کے ملکہ کو خلافت کے اہلیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا اور آپ نے یہ بھی دیکھا کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کی خلافت کی مخالفت کی۔ یہ قصہ بھی اُسی مقصد کو بیان کرنے کا ایک دوسرا انداز ہے اور اُس کی مزید شرح اور تفصیل بیان کرتا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِٱلۡجُنُودِ قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ مُبۡتَلِيكُم بِنَهَرٖ فَمَن شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّي وَمَن لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَإِنَّهُۥ مِنِّيٓ إِلَّا مَنِ ٱغۡتَرَفَ غُرۡفَةَۢ بِيَدِهِۦۚ فَشَرِبُواْ مِنۡهُ إِلَّا قَلِيلٗا مِّنۡهُمۡۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُۥ هُوَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ قَالُواْ لَا طَاقَةَ لَنَا ٱلۡيَوۡمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦۚ قَالَ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُواْ ٱللَّهِ كَم مِّن فِئَةٖ قَلِيلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةٗ كَثِيرَةَۢ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُواْ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ قَالُواْ رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرٗا وَثَبِّتۡ أَقۡدَامَنَا وَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذۡنِ ٱللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُۥدُ جَالُوتَ وَءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلۡمُلۡكَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهُۥ مِمَّا يَشَآءُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ

ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ ٱلْأَرْضُ وَلَـٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿٢٥١﴾ تِلْكَ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِٱلْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾

(۲۴۹)۔ توجب طالوت اپنے لشکر نکال لایا، تو کہا: اللہ ایک نہر کے ذریعے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے، توجس نے اُس میں سے پانی پی لیا وہ میرے گروہ میں سے نہیں، میرا ساتھی صرف وہ ہے جس نے (اُس کا ذائقہ) نہیں چکھا، سوائے اِس کے کہ کوئی اپنے چلو میں لے کر ایک گھونٹ ہی بھر لے۔ مگر تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ اُنہوں نے وہ پانی پی لیا۔ توجب وہ اور اُس کے مومن ساتھی پار اُترے تو اُنہوں نے کہا: آج تو ہم جالوت اور اُس کے لشکروں (کے مقابلے) کی طاقت نہیں رکھتے۔ مگر اُن لوگوں نے جن کو اللہ کے سامنے حاضر ہونے کا یقین تھا، کہا: کئی بار اللہ کے اِذن سے چھوٹے گروہ بڑے گروہوں پر غالب آتے رہے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (۲۵۰)۔ اور جب جالوت اور اُس کے لشکروں کے سامنے ہوئے تو کہا: اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما اور ہمارے قدم جما اور ہمیں اِن کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ (۲۵۱) پس اُنہوں نے اللہ کے حکم سے اُن کو شکست دے دی اور داوٗد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے بادشاہی اور حکمت سے نواز دیا اور جن جن چیزوں کا چاہا اُسے علم دیا۔ اور اگر اللہ کی بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے دفع کرنے کی (سنت) نہ ہوتی تو زمین پر تباہی برپا ہو جاتی، مگر اللہ کا دنیا والوں پر بڑا افضل ہے۔ (۲۵۲)۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ تمہیں سنا رہے ہیں۔ اور یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔

(۲۴۹۔۲۵۱)۔ جہاد صبر کرنے والوں کا کام ہے، بے صبر، کم ہمت، بے عزم، بے ارادہ اور وہ ضعیف النفس لوگ جو مشکلات برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت نہیں رکھتے، جہاد نہیں کر سکتے۔ جہاد کے بڑوں کو چاہئے کہ اپنے مجاہدین کو آزمائیں اور دیکھیں کہ اُن میں سے کون مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور یہ کہ کون مضبوط بازو، مطمئن دل، بلند ہمت اور راسخ عزم کا مالک اور صبر و برداشت رکھنے والا ہے تاکہ صرف اُنہی پر انحصار کریں اور اُنہی کے معیّت پر اعتماد رکھیں۔ بے ہمت اور بے صبر لوگ آدھے راستے کے ساتھی ہوتے ہیں۔ سخت وقت میں صفوں سے نکل جاتے ہیں اور مورچہ دشمن کے لئے خالی کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ساتھ فائدے کے بجائے نقصان دیتا ہے۔ اِسی لئے طالوت نے اپنے ساتھیوں سے کہا: میرا ساتھ وہ لوگ دیں جو آگے راستے میں ملنے والی نہر سے پانی نہ پئیں اور پیاس میں صبر سے کام لے سکیں۔ وہ بھی میرا ساتھ دیں جو ایک گھونٹ پر اکتفاء کر سکیں مگر وہ جو پیٹ بھر کر پانی پی لیں، میرے ساتھ چلنے کے اہل نہیں ہیں۔ (طالوت کی اِس آزمائش کی مثال ایسی ہے جس طرح ہم روزے کے مکلف کئے گئے ہیں، یہ دراصل روزے کے لئے ایک مثال اور نمونہ ہے، روزہ انسان میں صبر اور پرہیز گاری کی خصلت کو پروان چڑھاتا ہے)۔

اُس کے تمام لشکر میں سے صرف ایک قلیل گروہ اِس آزمائش پر پورا اُترا اور اُسی کو اللہ نے اُس مغرور اور ظالم دشمن پر فتح عطا کی۔ فتح صبر کرنے والوں کے حصے میں آتی ہے، وہی جن کو اللہ پر اعتماد ہوتا ہے، اُس کی نصرت کے منتظر ہوتے ہیں اور مورچے میں اور دشمن کے مدِ مقابل اللہ سے صبر اور استقامت کی دعا مانگتے ہیں۔ نہ کہ اُن لوگوں کے حصے میں جن کی تعداد زیادہ ہو۔ بارہا یہ منظر دیکھا گیا ہے کہ ایک چھوٹی سی ٹکڑی کو اللہ نے لاؤلشکر پر فتح عطا کی ہے یہ اِس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

اِس معرکے میں دشمن کی فوج کا سالار داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اِسی جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو اُس ملک کی بادشاہی اور اقتدار حوالے کیا، علم اور حکمت سے نواز دیا اور پیغمبری کے مقام پر پہنچا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اور اِسی پر وہ راضی ہوتا ہے کہ مومنوں کی قیادت ایسے ہی مجاہد سالاروں کے ہاتھ میں رہے۔

اِس آیت سے چند باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں: کرۂ ارض کو تباہی سے مامون رکھنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مومنین کے صالح گروہ کے ہاتھوں کافروں کے فاسد گروہ کا راستہ روکا جائے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعے اِن کا شر دفع کرتا ہے اور اِس طرح زمین کو تباہی سے بچاتا ہے۔ اِس الٰہی سنت کے مطابق ہمیشہ مومنوں کا ایک مجاہد گروہ کھڑا ہوا کرے گا جو مُفسد قوتوں کا مقابلہ کرے گا اور اللہ اُسے شر اور فساد کی قوتوں پر غلبہ عطا کرے گا۔ بخاری کی حدیث ہے کہ:

عن ثوبان قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم لا تزال طائفة من أمتى ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى يأتى أمر الله و هم كذالك۔

ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی نے فرمایا: میری اُمت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا ہو گا جو حق کے ساتھ بالا دست ہو گا۔ وہ لوگ اُسے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو اُسے اکیلا چھوڑ دیں، تاوقتیکہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے اور یہ اِسی حالت میں ہوں گے۔

(۲۵۲)۔ پچھلی آیات میں پیغمبروں اور اُن کے جہاد کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ الٰہی ارشادات ہیں اور اِسی لئے وہ تمام حق ہیں۔ پیغمبر اور اُن کی ماموریتیں ایسی ہی ہوتی ہیں؛ تم بھی اُنہی پیغمبروں میں سے ہو اور تمہاری ماموریت بھی اُنہی سے مشابہ ہے۔

تِلْكَ ٱلرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ ٱللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَٰتٍ ۚ وَءَاتَيْنَا عِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ ٱلْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقْتَتَلَ ٱلَّذِينَ مِنۢ بَعْدِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ وَلَٰكِنِ ٱخْتَلَفُوا۟ فَمِنْهُم مَّنْ ءَامَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقْتَتَلُوا۟ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾

(۲۵۳)۔ یہ وہی انبیاء ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ اِن میں سے بعض کے ساتھ اللہ نے تکلم کیا اور بعض کے درجات (دوسری حیثیتوں سے) بلند کئے۔ اور عیسیٰ ابنِ مریم کو ہم نے کھلی نشانیاں دیں اور روحُ القدس کے ذریعے اُس کی مدد فرمائی۔ اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اُن کے بعد یہ لوگ کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپس میں لڑتے مگر اِنہوں نے آپس میں اختلاف کیا، کہ بعض تو ایمان لائے اور بعض کافر ہوئے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔

---

(۲۵۳)۔ مختلف قِسم کے معجزے، انفرادیتیں اور صلاحیتیں دے کر بہت سے پیغمبر بھیجے جا چکے ہیں، لیکن اِس کے باوجود کسی پیغمبر پر سب لوگ ایمان نہیں لائے بلکہ لوگ قِسم قِسم کے گروہوں میں بٹتے رہے ہیں۔ بعض ایمان لائے، بعض نے انکار کیا اور بعض پیغمبروں کے خلاف آمادۂ جنگ ہوئے۔ یہ اللہ کی سنت ہے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تو اے پیغمبر! اور اے پیغمبر کے امتیو! یہ گمان نہ کرو کہ مخالفتوں سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ اختلافات ایک طبعی امر ہے اور مومنوں اور کافروں کے درمیان معرکہ آرائی بھی۔ اگر عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام جیسے پیغمبر مخالفتوں سے مامون نہیں رہ سکے اور اُن کے وہ لاتعداد حیران کُن معجزے مخالفتوں کی راہ نہ روک سکے تو تمہیں بھی اِس کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ مخالفتوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہو، باطل کے مقابلے کے لئے کمر کس لو، تصادم کا واقع ہونا لازمی اور الٰہی سنتوں کے مطابق امر ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَـٰكُم مِّن قَبۡلِ أَن يَأۡتِيَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَـٰعَةٌ ۗ وَٱلۡكَـٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ ٱللَّهُ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلۡحَىُّ ٱلۡقَيُّومُ ۚ لَا تَأۡخُذُهُ ۥ سِنَةٌ وَلَا نَوۡمٌ ۚ لَّهُ ۥ مَا فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَمَا فِى ٱلۡأَرۡضِ ۗ مَن ذَا ٱلَّذِى يَشۡفَعُ عِندَهُ ۥۤ إِلَّا بِإِذۡنِهِۦ ۚ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهِۦۤ إِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَٱلۡأَرۡضَ ۖ وَلَا يَـُٔودُهُ ۥ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ ٱلۡعَلِىُّ ٱلۡعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾

(۲۵۴) اے ایمان والو! ہماری طرف سے دی گئی روزی میں سے انفاق کرو، قبل اِس کے کہ وہ دن آ پہنچے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکتی ہے اور نہ دوستی اور شفاعت۔ اور کافر ہی ظالم ہیں۔ (۲۵۵)۔ اللہ وہ ذات ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہی زندہ قائم

ذات، نہ اُسے اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے سامنے سفارش کر سکے گا۔ حال یہ ہے کہ وہ سب کچھ وہ جانتا ہے جو اِن کے سامنے ہے یا اِن کے پیچھے (سے اوجھل)۔ اور یہ اُس کے علم میں سے صرف اُتنے (ہی حصے) کا احاطہ کرسکتے ہیں جتنا وہ چاہے۔ اور اُس کی کُرسی (قدرت اور اقتدار) آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور اِن دونوں (زمین و آسمان) کا انتظام اُس کو نہیں تھکاتا۔ اور وہ عظیم برتر ذات ہے۔

---

(۲۵۴)۔ یہاں اللہ کی راہ میں انفاق کی طرف بلایا گیا ہے اور مومنوں کو کہا گیا ہے کہ اُس دن کے آنے سے پہلے اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کریں جس دن نہ تو کوئی خرید و فروخت ہو سکے گی اور نہ رشتہ داری کا کوئی ایسا تعلق رکھا جاسکے گا جس کے سہارے مجرم رشتہ داروں کو اللہ کے مواخذے سے بچایا جاسکے اور نہ کسی کی سفارش فائدہ دے سکے گی۔ تمہارا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو گا۔

(۲۵۵)۔ یہ آیتِ مبارک آیت الکُرسی کہلاتی ہے۔ اِس کی عظمت کے بارے میں بہت ساری احادیث مروی ہیں:

عن أبی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه و سلم سيدة آی القرآن آية الكرسی۔ رواه احمد و الترمذی

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت الکُرسی قرآن کی تمام آیات کی سیّد ہے۔

عن الحسن بن علی قال قال رسول الله صلی الله عليه و سلم من قرأ آية الكرسی فی دبر الصلاة المكتوبة كان فی ذمة الله إلی الصلاة الأخری۔ رواه الطبرانی

حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کی تلاوت کی تو دوسری نماز تک اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور امان میں رہے گا۔

اِس عظیم الشان آیت میں اللہ تعالیٰ کا تعارف انتہائی جامعیت اور گہرائی کے ساتھ اِس طرح کیا گیا ہے کہ توحید کی تمام بنیادی اساسات بھی سمجھائی گئی ہیں اور اللہ کی بابت تمام مشرکانہ تصورات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اِس مبارک آیت کی رہنمائیاں درج ذیل ہیں:

- اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، اُس کے علاوہ کوئی ہستی اور کوئی چیز اِس قابل نہیں ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے اور اُس سے دعا مانگی جائے۔
- وہ زندہ اور جاوید ہے۔

- تمام عالم کا پالنے والا اور نگہداشت کرنے والا ہے۔ اِس عالم کی ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے اور وہی ہر چیز کو قوامیت دیتا ہے۔ وہ اِس عالم کے انتظام، نگرانی اور پالنے پوسنے کے عمل سے ایک لحظہ بھی توجہ نہیں ہٹاتا، اُسے اونگھ اور نیند نہیں آتی تا کہ اُس کی وجہ سے اِس سے غافل ہو جائے۔
- آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز اُسی کی ملکیت ہے۔ اُسی نے اِنہیں پیدا کیا ہے اور سب اُسی کے منقاد اور تابع فرمان ہیں۔ کوئی اُس کا شریک نہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین کی کوئی ایک چیز کسی اور کی ملکیت ہو یا کوئی اور کسی چیز میں اللہ کے ساتھ شراکت رکھتا ہو کہ اُس کے دینے یا لینے میں اُس کی مرضی جاننا ضروری ہو جائے۔
- کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ اُس کے امر اور اجازت کے بغیر اُس کے حضور کوئی مطالبہ پیش کر سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی کی دعا کسی دوسرے کے حوالے سے یا اُس کی سفارش کی وجہ سے قبول کرے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ آخرت میں کسی کے کہنے پر کوئی اُس کی گرفت اور مواخذے سے بچ جائے۔ کسی کی دعائیں قبول کرنے، کسی کے بارے میں کسی کی شفاعت سننے اور کسی کو شفاعت کی اجازت دینے کا فیصلہ وہ خود کرتا ہے۔
- دُنیوی حکام کی طرح نہیں ہے کہ دربار کے مقربین اُسے کسی کی اہلیتوں کی خبر دے دیں اور کہیں کہ: فلاں مخلص ہے۔ رحم کے قابل اور نیک طنیت ہے۔ اِس قابل ہے کہ اُس کی بات مانی جائے، اُس کی دعا قبول کی جائے اور اُس کے گناہوں سے درگزر کیا جائے، امید ہے کہ آگے چل کر کام آئے گا۔ اللہ تو اِن کی مانند نہیں ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے، لوگوں کے ظاہر اور چھپے اعمال، نیت، ماضی اور مستقبل سے باخبر ہے۔ کس طرح کسی کی جرأت ہو سکتی ہے کہ اُس کے سامنے کسی کی تعریف، سفارش اور شفاعت کرے؟
- ہر کسی کو علم اور سمجھ وہ عطا کرتا ہے۔ اِن کی آنکھیں، دل، کان، دماغ اور اعصاب اگرچہ راستہ اِس کو دکھاتے ہیں مگر سب اُس کے ارادے کے تابع ہیں اور اچھے برے، مفید اور مضر کی پہچان میں اِس کی مدد کرتے ہیں۔ جس چیز کا بھی انسان اپنے علم سے احاطہ کرتا ہے اور جس چیز کو بھی سمجھنے کی توفیق پاتا ہے، یہ تمام اللہ کے اذن اور مرضی سے اُنہی حدود کے اندر رہوتا ہے جو اللہ مقرر کرتا ہے۔
- اُس کے اقتدار اور حکمرانی کی کرسی آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے اور وہ اِن کا مالک، حکمران اور اختیار مند ہے۔ یہاں سب کچھ اُسی کے ارادے سے واقع ہوتا اور انجام پاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اپنی ملکیت کے انتظام، حفاظت اور

نگہداشت کا کوئی حصہ یا بعض کام اُس نے کسی دوسرے کے حوالے کر دیئے ہوں اور اب وہ دوسری ذات بااختیار ہو کر اپنی مرضی کے مطابق اِس میں تصرف کر رہی ہو۔

- وہ آسمانوں اور زمین کی نگہداشت اور ربوبیت خود ہی کرتا ہے۔ اِن دونوں کی نگہداشت اور ربوبیت سے تھک نہیں جایا کرتا، ایسا نہیں ہے کہ کسی کی مدد کا محتاج ہو اور اُسے اپنے ساتھ اِس کام میں شریک کرلے۔ دنیوی حکام کی طرح نہیں ہے کہ تھکن اور بیزاری کی وجہ سے اپنی سلطنت کے بعض کام دوسروں کے سپرد کردے۔
- وہ عظیم اور برتر ذات ہے، ہر عیب اور نقص سے بالاتر، ہر چیز اور ہر ذات سے اعلیٰ و ارفع۔ مشرکین کے مشرکانہ تصورات سے بلند تر، اتنا بلند کہ کوئی اُس کی برابری نہیں کر سکتا، نہ کوئی اِس عالم کی نگہداشت اور ربوبیت میں اُس کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کام اتنا بڑا اور مشکل ہو سکتا ہے جس کے کرنے سے وہ عاجز ہو۔

لَآ إِكْرَاهَ فِي ٱلدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسْتَمْسَكَ بِٱلْعُرْوَةِ ٱلْوُثْقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَا ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ يُخْرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ ۖ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ أَوْلِيَآؤُهُمُ ٱلطَّٰغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ ٱلنُّورِ إِلَى ٱلظُّلُمَٰتِ ۗ أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

(۲۵۶)۔ دین میں اکراہ (زبردستی منوانا) نہیں ہے۔ ہدایت کو ضلالت اور گمراہی سے متمیز کر دیا گیا ہے، تو جو کوئی طغیان کرنے والے (طاغوت) کا انکار کرے اور (پھر) اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے ایسی مضبوط رسی سختی کے ساتھ تھام لی جس کا ٹوٹنا ممکن نہیں اور اللہ تو نہایت جاننے والا سننے والا ہے۔ (۲۵۷)۔ اللہ اُن کا ولی ہے جو ایمان لے آئے، اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو کافر ہوئے ہیں؛ اُن کے دوست طاغوت ہیں، جو اُنہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں، یہ دوزخی ہیں، وہاں ہمیشہ رہنے والے۔

(۲۵۶)۔ اِس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی سنت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو دین ماننے پر مجبور کر دے۔ اُس کے دین میں زبردستی دوسروں کو ماننے پر مجبور کرنے کا رواج نہیں ہے۔ اللہ نے جہاد اِس لئے فرض نہیں کیا ہے کہ دین کو دوسرے لوگوں پر زبردستی مسلط کر دے۔ جہاد اِس لئے فرض کیا گیا ہے کہ مظلوم انسانوں کے ہاتھ پیروں میں پڑی وہ بیڑیاں توڑ دی جائیں جو ظالموں نے اُنہیں پہنائی ہیں۔ وہ تمام رکاوٹیں جو انسان کی آزادی کی راہ روکتی اور اُسے دوسروں کی غلامی پر مجبور کرتی ہیں سامنے سے ہٹا دی جائیں۔ مظلوم اور کمزور (مستضعف) انسانوں پر ظالموں کے جابرانہ اور ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ ہو جائے، جبر و استبداد کی حکمرانی اختتام پذیر ہو اور کسی کی گردن اپنے رب کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے خم نہ ہو۔ کوئی کسی کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھے اور کوئی کسی کے سر، مال اور عزت پر دست درازی کی جرأت نہ کرے۔ جہاد انسان کے لئے مواقع فراہم کرتا ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ اور کسی جبر اور اِکراہ کے بغیر ہر انسان حق اور باطل کے بارے میں فیصلہ اور رائے دے سکے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ تمہیں اِس بات یا اُس بات میں سے کسی ایک کے ماننے پر مجبور کرے۔ اللہ نے تمہیں ایسا پیدا فرمایا ہے کہ حق اور باطل یا مفید اور مضر میں سے جو چاہو اُس کا انتخاب کر سکو؛ وہ نہ تو تمہیں حق ماننے پر مجبور کرتا ہے اور نہ باطل سے روگردانی پر۔ وہ تمہاری ہدایت کے لئے انبیاء بھیجتا ہے، اُن کے ہاتھ اپنی کتاب بھیج کر تمہارے سامنے رکھتا ہے، تمہیں حق اور باطل کھول کر دکھاتا ہے، دلائل پیش کرتا ہے اور اُس کے بعد اختیار تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے کہ جسے چاہو اختیار کر لو اور جس راستے پر چاہو چل پڑو۔ مگر جان لو جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے اُس نے ایک ایسی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہے جسے کبھی ٹوٹنا نہیں۔ یہ ایسا رابطہ ہے جسے کوئی چیز اور کوئی ذات قطع نہیں کر سکتی۔ یہ اِس لئے کہ طاغوت کا انکار کر کے اور اللہ پر ایمان لا کر تم نے اپنے راستے کی وہ تمام رکاوٹیں اور موانع صاف کر دیئے جو تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان آڑ بن سکتے تھے۔ یہ اِس لئے کہ اب تم نے اُس ذات کے ساتھ روابط استوار کر لئے ہیں جو ہر وقت تمہاری پکار سنتی ہے، دعائیں قبول کرتی ہے اور تمہارے حال سے باخبر اور تمہاری احتیاجات سے واقف ہے۔ ایسی (سمیع: خوب سننے والی اور علیم: خوب جاننے والی) ذات کے ساتھ باندھے گئے رابطے ہمیشہ مضبوط رہا کرتے ہیں اور کبھی ٹوٹنے نہیں پاتے۔

اِس مبارک آیت میں اِس پر بھی غور کریں کہ طاغوت کا انکار اللہ پر ایمان سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے طاغوت کا انکار کرو گے تو پھر تمہارے اندر اللہ پر ایمان لانے کی اہلیّت پیدا ہوگی۔ جب تک طاغوت کا انکار نہیں کرو گے اور اُس سے اپنی برأت کا اعلان نہیں کرو گے، اللہ تمہارے ایمان کا دعویٰ قبول نہیں کرے گا۔ کلمۂ توحید میں بھی تمہیں یہی درس دیا گیا

ہے، پہلے اللہ کے علاوہ دوسرے ہر اِلہ کا انکار کیا جاتا ہے تو پھر اللہ کے اثبات کی بات ہوتی ہے: پہلے لا الہ کہہ دیا جائے تو پھر الا اللہ کہنے کی باری آتی ہے (لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا: اقبال)۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، خود بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ایمان دار ہیں مگر چونکہ طاغوت کی نفی نہیں کر چکے ہوتے، طاغوت سے خوف اور اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے ہوتے ہیں، اُس کی حکمرانی کے آگے سر جھکاتے ہیں، اپنے تنازعات اور معاملات کے حل اور فصل کے لئے اُسی سے رجوع کرتے ہیں اور اُسی کے فیصلوں پر آمنّا وصدّقنا کہتے ہیں؛ اِس لئے ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن بار بار اور قاطع الفاظ میں فرماتا ہے کہ اِن کے ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ ءَامَنُوا۟ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّٰغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا۟ أَن يَكْفُرُوا۟ بِهِۦ وَيُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ النساء ۶۰

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اِس زعم میں مبتلا ہیں کہ تم پر نازل کی گئی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور تم سے پہلے نازل کی گئی کتابوں پر بھی، مگر چاہتے ہیں کہ تحاکم (فیصلوں) کے لئے طاغوت کی طرف دیکھیں، حالانکہ اِن کو حکم دیا گیا ہے کہ اُس کا انکار کروگے؛ اور شیطان چاہتا ہے کہ اِس طرح اُنہیں عمیق گمراہی میں مبتلا کرے۔

(۲۵۷)۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کا مولا اور کارساز اللہ ہوتا ہے، وہ اُنہیں قِسم قِسم کے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ ہر طرف جہل کی ظلمت چھائی ہوئی ہوتی ہے اور راستہ او جھل؛ اللہ اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُن کو اندھیروں سے نکالتا ہے۔ کسی بھی اضطراب، پریشانی اور خوف کی حالت میں اُن کو اکیلا نہیں چھوڑتا اور اُن پر مشکلات سے نکلنے کی راہیں کھولتا ہے۔ مگر کافروں کے اولیاء اور پالنہار طاغوت ہیں، جو اُن کی رہنمائی نور اور روشنی سے اندھیروں کی طرف کرتے ہیں۔ کبھی اقتدار کا مالک طاغوت اُن کو گمراہ کرتا ہے، کبھی زیرک اور چالاک سیاسی بازیگر اور کبھی دین کے نام پر دین فروش دھوکے باز۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِى حَآجَّ إِبْرَٰهِـۧمَ فِى رَبِّهِۦٓ أَنْ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّىَ ٱلَّذِى يُحْىِۦ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا۠ أُحْىِۦ وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

(۲۵۸)۔ کیا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ابراہیم کے ساتھ، اللہ کی طرف سے دی گئی بادشاہی کے زعم میں آکر، حجت کر رہا تھا۔ جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو جِلاتا اور مارتا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ: جینے مرنے کا فیصلہ میں کرتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تم اُسے مغرب سے نکال لاؤ اگر سچے ہو تو وہ جو کافر ہوا تھا مبہوت اور حیران رہ گیا (اُسے کہنے کے لئے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا)۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

---

(۲۵۸)۔ اِس مبارک آیت میں ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے قصے کی آڑ میں اُسی اوپر بیان کی گئی حقیقت کی تشریح اور تاریخ سے اُس کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔ اُس شخص کا نمونہ جس کا ساتھ اللہ دے رہا ہو اور اُسے اندھیروں سے روشنی کی طرف لے جارہا ہو اور اُس شخص کا بھی جس کا ساتھی طاغوت ہو اور اُسے روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جارہا ہو۔ ایک طرف نمرود ہے جسے اپنے اقتدار نے مغرور بنایا ہوا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ لوگوں کی زندگی اور موت اُ سی کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی سلطنت اور بادشاہی ہی وہ "طاغوت" ہے جس نے اُسے دھوکے میں مبتلا کیا ہوا ہے، حقیقت کے اعتراف میں مانع ہوئی ہے اور اُس کے اندھیروں میں بھٹکنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ مگر دوسری طرف ابراہیم علیہ السلام ہے جس کی موت کا فیصلہ صادر ہوا ہے، اُسے جَلانے کے لئے ایک بڑی آگ روشن کی گئی ہے، بھڑکتی آگ میں اُس کے جلنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے لوگ جمع کئے گئے ہیں اور اُسے زندان سے نکال کر وہاں لایا گیا ہے۔ نمرود کے دربار میں کھڑا ہے، جلاد اُس کے پہلو میں اور لوگ باہر آگ کے پاس اُس کے پھینکے جانے کے منتظر کھڑے ہیں۔ اِسی ہیبت ناک اور حساس لمحے میں ابراہیم علیہ السلام تمام تر اطمینان اور سکون کے ساتھ کہتا ہے: میری زندگی اور موت کا فیصلہ تو میرا رب کرتا ہے۔ ایسی حالت میں ایسی بات کہنے کی عظمت کا اندازہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ ایسی بات صرف اور صرف وہ شخص کر سکتا ہے جس کا ہادی ور ہنما اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ ملاحظہ کریں: اللہ مومنوں کا مولا ہے، اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ اسی جرأت مندانہ حق گوئی کے سبب اللہ نے آپؑ کو نمرود کی آگ سے بچالیا۔

یہ آیت چند اہم باتیں ہمارے سامنے رکھتی ہے:

- ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کہ زندگی اور موت کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، اُس شخص کے سامنے کی ہے جسے اپنے اقتدار نے مغرور بنا دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کو قید میں ڈال کر اُس کے قتل کرنے اور آگ میں جلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ہم ابراہیم علیہ السلام کے اِس بیان کی اہمیت کو تب سمجھ سکتے ہیں جب اُس منظر کو چشمِ تصور میں لائیں۔ عام حالت میں یہ بات کہنا اور معنی رکھتا ہے مگر ایسی حالت میں جب کسی کے قتل اور آگ میں جلائے جانے کا فیصلہ ایک بے رحم اور مغرور حاکم کی طرف سے صادر ہو چکا ہو، تمام لوگ اُس کے جلائے جانے پر متفق ہوں، اِس مقصد کے لئے ایک بڑی آگ اور اُس میں پھینکے جانے کے لئے منجنیق

تیار ہو چکا ہو اور تمام لوگ اُس کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو چکے ہوں تو پھر اِس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اِس کے باوجود کہتا ہے کہ: میری موت کا فیصلہ تو اللہ کرے گا۔

- مغرور حکمران اِس کے جواب میں کہتا ہے: لوگوں کی موت اور زندگی کا اختیار تو میرے ہاتھ میں ہے، یہ ہے دیکھ لو کہ اِن دو بندوں میں سے جو رہائی کا مستحق ہے اُس کے قتل کا حکم صادر کرتا ہوں اور جو قتل کا مستحق ہے اُسے چھوڑ تا ہوں۔
- ابراہیم علیہ السلام جواب دیتا ہے: میرا رب وہ ذات ہے جو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اُسے مغرب سے نکال کر دکھا دو اگر سچے ہو۔ یعنی جس طرح رات اور دن اللہ کے اِذن سے آتے جاتے ہیں اور سورج اُس کے ارادے کے تحت اپنی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور اپنی جگہ غروب ہوتا ہے، دنیا کی کوئی طاقت اُس کے آنے جانے کا وقت تبدیل کر سکتی ہے اور نہ جگہ۔ اِسی طرح زندگی اور موت کا فیصلہ بھی صرف اللہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے اور اِس کام میں بھی دنیا کی کسی طاقت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔
- ظالم لوگ اللہ کی رہنمائی سے محروم اور حقیقت کے ادراک سے عاجز ہیں، ظلم نے اُن کے دل ٹیڑھے اور حواس معطل کر دیئے ہیں۔
- ملاحظہ کریں: ابراہیم علیہ السلام زندگی اور موت کے طبیعی اور روزمرہ سلسلے، رات دن کے آنے جانے اور سورج کے طلوع اور غروب سے استدلال کرتا ہے اور اِنہیں ہی اللہ کے وجود اور قدرت کی نشانیاں سمجھتا ہے مگر کافر نمرود اِس سے قانع نہیں ہو رہا اور خارقِ عادت نشانیاں مانگتا ہے۔ اگر آپ قرآن پر غور کریں تو جان لیں گے کہ کافر ہمیشہ اللہ پر ایمان لانے کے لئے خارقِ عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور قرآن اُنہیں ہر مرتبہ طبیعی حوادث بطورِ دلیل پیش کرتا ہے۔ اِس سے دو مختلف ذہنیتوں کی نشان دہی ہوتی ہے: ایک وہ جس کے لئے عالم میں پھیلی ہوئی یہ گونا گوں نشانیاں کفایت نہیں کرتیں، وہ پیغمبر سے بھی خارقِ عادت نشانیاں طلب کرتی ہے۔ یہ ذہنیت ایک عام انسان کو بطور پیغمبر قبول کرنے سے ہی قاصر ہوتی ہے۔ ایسے لوگ قرآن کی آیات کی بھی ایسی تعبیر پسند کرتے ہیں جن سے غیر عادی اور خارقِ عادت مفاہیم کا اظہار ہوتا ہو۔ اِس آیت میں ہمیں کہا گیا ہے کہ جس کسی کے لئے اِس عالم میں پھیلی ہوئی یہ بے شمار آیات کفایت نہ کرتی ہوں وہ کافرانہ ذہنیّت رکھتا ہے اور نمرود کی راہ پر چل رہا ہے اور جس کے لئے یہ نشانیاں کافی ہوں وہ مومنانہ ذہنیّت رکھتا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر گامزن ہے۔
- یہ بات مدِ نظر رہے کہ یہ کوئی مناظرے کی غرض سے منعقد کردہ اجتماع نہیں تھا کہ ایک طرف نمرود اور دوسری طرف ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہیں۔ ایک اللہ کی وجود کے دلائل دے رہا ہے اور دوسرا اُن کا انکار کر رہا ہے۔

افسوس ہے کہ بعض لوگ اِس کی ایسی ہی منظر کشی کرتے ہیں کہ گویا ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں گیا ہوا ہے اور اُس کے ساتھ کوئی دوستانہ مناقشہ ہو رہا ہے، جس میں یہ اُسے اللہ کی طرف بلا رہا ہے اور دلیل میں اللہ کی زندگی اور موت پر قادر ہونے کی مثال پیش کر رہا ہے۔ اِن دوستوں نے قرآن کی اُن تمام آیات پر غور نہیں کیا جن میں ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ بتوں کو گرانے کے بعد اُس کے آگ میں جلانے کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ نمرود کے دربار میں آپؑ کا داخلہ ایک ایسے بڑے باغی کا لایا جانا تھا جس نے نمرود اور اُس کی قوم کے خداا وندھے منہ گرائے ہیں اور پکڑے جانے کے بعد نہ صرف اپنے "جرم" کا اعتراف کر چکا ہے بلکہ اُس کے دفاع پر بھی بضد ہے اور بتوں اور اُن کے پوجنے والوں کی تحقیر بھی کر رہا ہے۔ اگر ہم ابراہیم علیہ السلام کے قصے کا یہ حصہ دوسری تمام متعلقہ آیات کی روشنی میں چھیڑیں تو یہ منظر کچھ یوں ہو گا کہ: ابراہیم علیہ السلام کو معبد سے زندان لے جایا گیا ہے۔ آگ میں ڈالنے کے لئے جو دن مقرر کیا گیا اُس دن نمرود کے دربار میں پیش کیا گیا ہے اور آپؑ کو کہا گیا ہے کہ: اب بولو! تم نے کس طرح ہمارے معبودوں کو توڑنے کی جرأت کی ہے، اَب کون تمہیں موت سے بچائے گا؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا ہے: میرا رب؛ وہی جو زندگی اور موت کا فیصلہ کرتا ہے۔ نمرود نے کہا ہے: اب تمہیں دکھاتا ہوں، زندگی اور موت کا فیصلہ تیرا رب کرتا ہے یا میں۔ اِس کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہے: اگر تم اتنے اختیار مند ہو تو یہ سورج جسے میرا رب مشرق سے نکالتا ہے اِسے ذرا مغرب سے نکال کر دکھاؤ! یہ دندان شکن جواب سننے کے بعد نمرود کے پاس اِس کے علاوہ کیا چارہ رہا ہو گا کہ کہے: اِس گستاخ کو آگ میں پھینک دو تا کہ یہ خود بھی اپنی بے باکی کی سزا پائے اور دوسروں کے لئے بھی سامانِ عبرت بنے۔

أَوْ كَٱلَّذِى مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْىِۦ هَـٰذِهِ ٱللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ ٱللَّهُ مِا۟ئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُۥ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِا۟ئَةَ عَامٍ فَٱنظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَٱنظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ ءَايَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَٱنظُرْ إِلَى ٱلْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾

(۲۵۹)۔ اور یا اُس شخص کی طرح جو ایک ایسی بستی سے گزرا جو اپنے چھتوں پر اُوندھے منہ گری ہوئی تھی، اُس نے کہا: ان کے اِس طرح مر جانے کے بعد اللہ اِن کو کیسے زندہ کرے گا، تو اللہ نے اُس پر سو سال تک موت طاری کر دی۔ پھر اُسے زندہ کیا اور اُسے فرمایا: کتنا عرصہ رہے، اُس نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، اللہ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو سال اِسی (موت کی) حالت میں رہے، اپنے کھانے پینے کو دیکھو کہ گلا سڑا نہیں ہے اور اپنے گدھے کو دیکھو۔ یہ اِس لئے کیا گیا کہ تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیا جائے۔ اب (اپنے گدھے کی بوسیدہ) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم اُنہیں کس طرح جمع کرتے ہیں۔ اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں، تو جب اُس پر واضح ہوا تو اُس نے کہا: اب اچھی طرح جان گیا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

---

(۲۵۹)۔ یہ اللہ کا ایک مومن بندہ تھا (اگرچہ ایک روایت میں عزیزؑ بتایا گیا ہے، وہی جسے یہودی اللہ کا بیٹا قرار دیئے ہوئے ہیں)، جو سفر پر کہیں جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی ساتھ تھیں۔ ایک ویران اور تباہ شدہ بستی پر سے گزرا تو دیکھا کہ ہر طرف لوگوں کی بوسیدہ اور سڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہیں۔ اُس کے دل میں خیال گزرا کہ اللہ تعالیٰ یہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ کو اُس کے اِس "کیسے" کا جواب دینا منظور تھا تا کہ اِس کے ذریعے اُن لوگوں کی ہدایت کا انتظام کیا جائے جو دوبارہ زندگی کے قائل نہیں تھے۔ لہٰذا اُسے سو سالہ موت سے ہم کنار کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور پوچھا کہ کتنا عرصہ اِس حال میں رہے؟ اُس نے جواب دیا: پتہ نہیں، لگتا ہے ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں! یہاں تمہارا قیام سو سال رہا۔ اپنی سواری کی بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھو اور دوسری طرف اپنے کھانے پینے کی چیزیں دیکھو کہ تر و تازہ پڑی ہوئی ہیں اور اب دیکھو کہ میں کس طرح اِن ہڈیوں کو جمع کرتا ہوں اور اِن پر گوشت چڑھا کر اِنہیں دوبارہ زندہ کرتا ہوں۔ یہ مومن بندہ اِس منظر کو دیکھ کر تسلی پا گیا اور کہنے لگا: اب خوب سمجھ گیا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس قصے میں دوبارہ زندگی کے بارے میں چند بنیادی سوالات رفع کئے گئے ہیں:

- دوبارہ زندگی کے بارے میں جو سوالات انسانی ذہن میں اُبھرتے ہیں اور شکوک پیدا کر کے یقین کرنا مشکل بناتے ہیں، اُن میں سے ایک سوال لمبے عرصے کا گزرنا بھی ہے۔ اگر کسی کو مرے ہوئے ایک دو دن گزرے ہوں تو اُس کا زندہ ہونا اتنا بعید از قیاس نہیں لگتا جتنا مدت پہلے مرے ہوئے شخص کا۔ اِس کہانی کے تناظر میں کہا گیا ہے کہ زمانہ (وقت) ایک اضافی (Relative) اَمر ہے۔ مختلف مواقع، مقامات، حالات اور لوگوں کے تناظر میں اُس کی وضع، احساس و ادراک بدل جاتا ہے۔ سوتے اور جاگتے، زندہ اور مردہ، تیز رفتار اور آہستہ رو سب کے لئے یہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ایک چیونٹی کے لئے جو کچھ بے انتہا ہے وہ ایک پرندے کے لئے چند ثانیے ہیں۔ اگر ایک ہی کمرے میں اقامت پذیر ایک سوتے اور ایک جاگتے سے، جنہوں نے ساری رات سوتے اور جاگتے گزاری ہو، دریافت کیا جائے، تو جاگتا

کہے گا: بڑی لمبی رات تھی، کروٹیں بدلتا رہا مگر گزرنے میں نہیں آرہی تھی، بڑی مشکل سے گزری ہے۔ جبکہ سوتا کہے گا: پتہ ہی نہیں چلا کہ رات کیسے گزر گئی اور میں نے کتنی نیند کی۔ اِس مومن بندے کو عملاً دکھا دیا گیا کہ سو سال ایک دن بلکہ اُس سے بھی کم، چند گھنٹے معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن نے اِسی حقیقت کی طرف بعض دوسری جگہوں میں بھی اشارہ کیا ہے، فرماتا ہے: اللہ کے لئے ایک دن اِتنا ہے جتنے تمہارے پچاس ہزار سال۔ یہ تمہی ہو جنہیں سال اور صدیاں ایک لمبا عرصہ لگتا ہے اور تمہارے ذہنوں پر اِس کا بڑا رعب واثر پڑا ہوا ہے کہ مردوں پر ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد وہ دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔ وقت کی اِضافیت کے بارے میں قرآن کی یہی بات بارہ سو سال بعد جرمنی کے ایک سائنسدان آئن سٹائن نے سائنس کی زبان میں کہی اور اِسی کی بدولت فزکس کا باپ کہلانے لگا۔

- دوسری بات یہ سمجھائی گئی ہے کہ موت کے بعد جب انسان کا جسم مٹی میں تبدیل ہو جائے گا، لمبا عرصہ گزرنے کے بعد اُس کے ہڈیوں اور گوشت کا کوئی اثر باقی نہیں رہ جائے گا، تو وہ کیونکر دوبارہ زندہ ہو گا؟ اِس قصے میں اُس مومن بندے کو دکھا دیا گیا کہ انسان کا وجود دو حصے رکھتا ہے: جسد اور روح۔ موت اُس کا ایک حصہ فنا کر دیتی ہے مگر دوسرا حصہ مکمل طور پر محفوظ (Untouched) رہتا ہے۔ اِسے یوں سمجھ لو جیسے (تمہاری سواری) اور (کھانا، پینا)۔ اُن میں سے ایک ختم ہو چکا مگر دوسرا ٹھیک ٹھاک رہا۔ تمہارا جسد تمہارے روح کے لئے بمنزلہ سواری کے ہے اور تمہاری روح ایسی ہے جیسے کہ کھانا پینا؛ تمہاری طاقت و توانائی کا منبع۔ موت کے ساتھ تمہارا سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک حصہ ٹھیک ٹھاک حالت میں رہ جاتا ہے۔ روح محفوظ رہتی ہے صرف اُس کی سواری اپنی حالت بدل لیتی ہے اور گوشت اور ہڈیاں مٹی میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اپنی اِس دوبارہ زندگی کو یوں سمجھ لو جیسے خزاں میں تمام نباتات مر جاتے ہیں، گل سڑ کر مٹی میں تحلیل ہو جاتے ہیں، ہمیں اُن کا کوئی اثر مٹی میں نظر نہیں آتا حتیٰ کہ سردیوں کا سارا موسم گزر جاتا ہے مگر بہار کی ایک بارش کی بدولت وہ سب زمین سے سر اُٹھا لیتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ ٱلطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ ٱجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ٱدْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَٱعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

(۲٦۰)۔ اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ (اللہ نے) فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے۔ تو کہنے لگا: کیوں نہیں! مگر چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے، تو فرمایا کہ: پرندوں میں سے چار لے

کر اپنے ساتھ ہلا (مانوس کر) لو پھر اُن کا ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر اُنہیں بلاؤ کہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں اور جان لو کہ اللہ باحکمت غالب ذات ہے۔

---

(۲۶۰)۔ اِس بات کا کہ اللہ مومنوں کا مولا اور رہنما ہے، اُنہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے، تیسرا نمونہ پھر ابراہیم علیہ السلام کی کی گئی رہنمائی سے پیش کیا گیا ہے۔ آپؑ کی بھی خواہش ہوئی کہ دوبارہ زندہ ہونے کی کیفیت کے بارے میں اُن کے دل کو اطمینان ہو اور جان لیں کہ اللہ تعالیٰ مردے کیسے اور کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ: چار پرندے پکڑ لو اُنہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو پھر اُنہیں اردگرد مختلف پہاڑیوں پر رکھ دو اور پھر اُنہیں بلا لو۔ تم دیکھ لوگے کہ وہ سب دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں۔ اگر یہ پرندے تمہارے چند دن کے پالنے پوسنے کے نتیجے میں دور سے تمہاری آواز پر لبیک کہتے ہوئے دوڑ کر تمہارے پاس آتے ہیں حالانکہ نہ تو تم نے اِنہیں پیدا کیا ہے اور نہ تمہیں اِن کے دل و دماغ پر کوئی اختیار و تصرف حاصل ہے۔ تو اللہ کی وہ مخلوق جن کا سب کچھ اُس کے ہاتھ میں ہے، زندگی اُس نے دی ہے، اُن کی روح اور جسم کا وہ خالق ہے، دل و دماغ اُس نے دیئے ہیں، وہ کس طرح اللہ کے ایک بلاوے پر لبیک نہیں کہیں گے اور اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہو کر اُس کی طرف چل نہیں پڑیں گے۔ کیا اللہ عزیز اور حکیم نہیں ہے؟ اگرچہ بعض محترم مفسرین نے اِس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اِن پرندوں کے ذبح کرنے، اُن کے گوشت کو آپس میں ملا لینے اور پھر ہر پہاڑ پر اُس مشترک گوشت کے ایک ایک حصے کے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور آپؑ نے یہی کام کر دیا ہے۔ پھر یہ سب کچھ کرنے کے بعد آپؑ کے بلانے پر یہ پرندے دوبارہ زندہ ہو کر آپؑ کے پاس آئے ہیں۔ مگر آیت میں نہ تو اُن کے ذبح کرنے کا ذکر آیا ہے اور نہ یہ ذکر آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہ کام کر گزرے اور پرندے زندہ ہو کر اُن کے پاس آ گئے۔ اِس کے برعکس جو بات کہی گئی ہے وہ صرف اپنے ساتھ مانوس کر کے اپنے پاس بلانے کی حد تک ہے اور آخر میں کہا گیا ہے کہ جان لو اللہ باحکمت غالب ذات ہے۔ آیت کے آخری حصے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات بطور ایک استدلال کہی گئی ہے نہ کہ بطور مشاہدے کے۔ مشاہدے کی صورت پچھلی مثال میں پیش کی گئی ہے اُس کی تکرار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ویسے بھی اتنی بزرگ و برتر ہے کہ اُن کے اطمینان کے لئے صرف دلیل ہی کافی ہوتی۔ یہ وہی ابراہیمؑ ہے جس نے ایک مشرک، اللہ اور آخرت سے منکر معاشرے اور گھرانے میں ایک بت پرست باپ کی گود میں آنکھیں کھولیں مگر اپنے عقلی استدلال سے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اور اپنے باپ اور قوم سے کہا: میں اِن سورج، چاند اور ستاروں اور نہ ہی تمہارے اِن بتوں کو معبود مانتا ہوں؛ میرا رب وہ ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے اور یہ کہ میں حادث اور فانی چیزوں کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔

اگر پچھلے قصے میں ذکر کئے گئے مومن کے الفاظ پر غور کریں اور اُس کا موازنہ ابراہیم علیہ السلام کے اِس قصے کے الفاظ سے کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ دونوں میں گہرا فرق موجود ہے۔ ایک کہتا ہے اللہ اِس ویران بستی کی یہ بوسیدہ ہڈیاں کیسے دوبارہ زندہ کرے گا؟ (أَنَّى يُحْيِي هَٰذِهِ اللّٰه بَعْدَ مَوْتِهَا) اِن الفاظ سے شک کا اظہار ہو رہا ہے۔ مگر دوسرا کہہ رہا ہے: اے اللہ: مجھے دکھادے کہ تو مردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔ ایک کے الفاظ میں سوال ہے جبکہ دوسرے کے الفاظ سے اُس خلش، تشنگی اور طلب(Demand) کا اظہار ہو رہا ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کی کیفیت جان سکے۔ ابراہیم علیہ السلام براہِ راست اپنے رب کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ کر دینے کی کیفیت دکھادے، دوبارہ زندہ ہونے پر یقین تو ہے مگر میرا دل چاہتا ہے کہ اِس کی کیفیت جان لوں۔ اُس مومن بندے کی ضرورت مشاہدے سے پوری ہو سکتی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کے لئے استدلال کافی تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے تو نمرود کے دربار میں آگ میں ڈالے جانے کے دن اُسی وقت اور اُسی جگہ کہا تھا کہ موت اور زندگی میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تو نمرود کی روشن کی گئی آگ سے زندہ نکل کر یہ حقیقت دیکھ چکا تھا اور اب پیغمبری کے منصب پر فائز ہو کر اللہ سے تکلم کر رہا ہے، ایسے انسان کے لئے تو بس اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

اگر مقصود پرندوں کا مارنا یا ذبح کرنا ہوتا تو حتماً قتل یا ذبح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہوتا۔ قرآن اپنے مخاطب کو ابہام میں نہیں ڈالتا۔ اگر (صرھن) کو مارنے کے معنوں میں لے لیا جائے تو پھر (الیک) کے ساتھ اِس کی مطابقت نہیں بنتی۔ اِس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہو جاتا ہے کہ: (اپنی طرف مار دینا) اور یہ ایک قطعی غلط جملہ ہے۔ صرھن کا اصل اور درست ترجمہ اپنے ساتھ عادی کرنا، سدھانا، مانوس کرنا اور اپنی جانب مائل کرنا ہے۔ اِس کے بعد (الی) کا صلہ بھی اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِس سے یہی معنٰی مراد ہے اس لئے کہ یہ (صلہ) مارنے کے معنٰی کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ الیک کے ساتھ صرف یہی معنٰی درست بیٹھتا ہے جس کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ اپنے ساتھ مانوس کرلو۔

بعض لوگ اِس آیت میں جُزْءاً کے لفظ سے یہ تاثر لیتے ہیں کہ اِس کا معنٰی اُن کے گوشت کا ایک ٹکڑا ہونا چاہیے نہ کہ پرندوں کا ایک حصہ۔ یہ استنباط درست نہیں ہے، قرآن میں دو اور مقامات پر بھی جُزْء کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ اُس کا معنٰی لوگوں کا ایک گروہ لیا گیا ہے۔

وَ جَعَلُوا لَه مِنْ عِبَادِهِ جُزْءاً إِنَّ الْإِنْسٰنَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ۔الزخرف: ۱۵
لَهَا سَبعَةُ أَبوَ بٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنهُمْ جُزْءٌ مَّقسومٌ۔ الحجر: ۴۴

جو کوئی صرھن سے قطعھن کا معنٰی مراد لیتا ہے وہ مجبور ہے کہ اپنی اِس تعبیر میں کافی تکلف سے کام لے اور اُسے کافی چیزیں اپنی طرف سے اِضافہ کرنی پڑیں گی، مثلاً درج ذیل باتیں:

- ابراہیم علیہ السلام نے یہ پرندے ذبح کیئے۔
- پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں گڈ مڈ کر لئے۔
- پھر اِس مشترک گوشت کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا۔
- پھر اُنہیں بلایا۔
- تمام زندہ ہو گئے۔
- اُڑ کر اُس کے پاس دوڑتے ہوئے آ گئے۔

مگر اِس آیت میں اِن میں سے ایک بات کے لئے بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ نہ کہیں مارنے کا صیغہ آیا ہے، نہ پرندوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا اور نہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ سارے کام کیے۔ یہ تمام باتیں اپنی طرف سے فرض کرنی پڑیں گی؛ نہیں تو تعبیر ناقص رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اِس پر بھی مجبور ہونا پڑے گا کہ کہہ دیا جائے کہ: (الی) کا لفظ زائد ہے کسی دور کے لفظ کا (صلہ) ہے۔

اِن دوستوں سے ہماری گزارش ہے کہ: اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں اللہ کے کلام میں اتنا تصرف جائز قرار دیتے ہو؟ کیوں اللہ کے مبین کلام کے بارے میں ایسی ذہنیت پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہو کہ اِس قدر تکلف اور تصرف کے علاوہ اُس کا سمجھنا ممکن نہ رہے؟ کیوں ایک صاف اور واضح معنٰی چھوڑ کر ایک تکلف سے بھرپور معنٰی اختیار کرتے ہو؟ اسی طرح اِن سے یہ بھی گزارش ہے کہ: اگر تمہاری یہ بات درست ہے تو آیت کے آخر میں پچھلی مثال کی مانند ابراہیم علیہ السلام کے لئے بھی وہی یا اُسی قِسم کے الفاظ آتے کہ: قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (اب اچھی طرح جان گیا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔ یہ نہ کہا گیا ہوتا کہ وَاعْلَمْ أَنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (اور جان لو اللہ باحکمت عزتمند ذات ہے)، یہ الفاظ تو یہی شہادت دے رہے ہیں کہ اوپر دی گئی مثال ایک استدلال ہے نہ کہ ایک مشاہدہ۔

ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو اتنا ہی استدلال کافی تھا، اُس عظیم موحد کے لئے تو ایک اشارہ ہی کافی تھا مگر کیا کریں کہ بعض لوگ صرف ایسے ہی جواب سے مبہوت اور مطمئن ہوتے ہیں جیسا ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے رکھا تھا کہ:
فَإِنَّ اللهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ!!
امر واقع یہ ہے کہ یہ مفسرین غلط اسرائیلی روایات کے زیرِ اثر آ گئے ہیں اور وہی بات کہہ رہے ہیں جو محرف بائیبل کہتی ہے۔ آئیں دیکھیں اِس بارے میں بائیبل کیا کہتی ہے:

بائیبل (ابرام کے ساتھ اللہ کا وعدہ) کے عنوان کے تحت فقرہ پانچ میں لکھتی ہے: رات کو خدا نے ابرام (ابراہیم علیہ السلام) کو گھر سے باہر بلایا اور اُسے کہا: آسمان کے ستاروں کو دیکھو کیا اِنہیں گن سکتے ہو؟ تمہاری نسل بھی اِن کی مانند بے شمار ہو گی! تو یہاں ابرام نے خدا پر اعتماد کیا اور اسی لئے خدا اُس سے راضی ہوا اور اُسے قبول کیا۔ خدا نے ابرام سے کہا: میں وہی خدا ہوں جس نے تمہیں آگ اور کلدانیوں سے نکالا تا کہ یہ علاقہ تمہیں دے دوں۔ ابرام نے کہا: خدایا! کیسے مطمئن ہو جاؤں کہ یہ علاقہ مجھے دے رہے ہو؟ خدا نے اُسے کہا: ایک تین سالہ گائے، ایک تین سالہ بکری، ایک تین سالہ دنبہ، ایک قمری اور ایک کبوتر لو۔ اُن کے سر کاٹ ڈالو، ہر ایک کو سر سے پیر تک دو ٹکڑے کر ڈالو اور اُن کے ٹکڑے پاس پاس رکھ دو۔ مگر پرندوں کے ٹکڑے نہ کرو، ابرام نے ایسا ہی کیا۔ شام تک گوشت خور پرندے جو اِس گوشت کے پاس آتے تھے، روک لئے، شام کے وقت ابرام گہری نیند سو گیا اور اُسے ایک وحشتناک اندھیرے نے گھیر لیا!!

یہاں چند نکات قابلِ غور ہیں:

- یہاں اور متعدد دوسرے مقامات پر بائیبل میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل کے خدا نے مصر کی حدود سے لے کر فرات کے ساحل تک کا تمام علاقہ اُن کو دیا ہوا ہے۔ یہاں پر کہا جا رہا ہے کہ خدا نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اُس کی نسل کو ستاروں سے زیادہ بڑھا دے گا اور یہ علاقہ اُس کی اولاد کے حوالے کر دے گا۔ آسمان کے ستاروں اور زمین کی ریت کے ذروں سے زیادہ بڑھانے والا مبالغہ بائیبل میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔ لگتا ہے اُس کا مُصنف یہ نہیں جانتا تھا کہ بنی اسرائیل کی کُل گنتی (یعقوب علیہ السلام سے لے کر قیامت تک) بھی اتنی نہیں ہو سکتی جتنی آسمان کے ایک چھوٹے سے حصے کے ستاروں کی گنتی۔ اگر آپ بائیبل کی یہ بات کسی ایسے شخص کو کہہ دیں جو ستاروں کے بارے میں تحقیقات کرتا ہو اور جانتا ہو کہ آسمان پر کتنے کہکشاں اور ہر کہکشاں میں کتنے ستارے ہیں تو وہ بتا دے گا کہ انسان کی پیدائش سے لے کر آج تک پیدا ہونے والے انسانوں کی گنتی ایک کہکشاں کے ایک حصے کے ستاروں کی گنتی کے بقدر بھی نہیں ہے اور یہ کہ آسمان میں قریباً ایک سو بیس ملین کہکشائیں موجود ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ علیم خدا نے ایسی مبالغہ آمیز اور خلافِ حقیقت بات کہی ہو اور کہا ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی تعداد آسمان کے ستاروں اور زمین کی ریت کے ذروں سے بھی زیادہ ہو گی۔ ایسی بات تو کوئی شاعر ہی کہہ سکتا ہے، کوئی ایک انسان بھی خصوصاً اگر وہ ایک عالِم اور محقق بھی ہو؛ اس طرح نہیں کہے گا۔

- خدا ابرام کو کہتا ہے کہ قربانی کرو، اگر تمہاری قربانی قبول ہو جائے تو تمہیں مطمئن رہنا چاہیے کہ میرا وعدہ پورا ہو کر رہے گا، قربانی کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کو ایک شعلہ گھیر لے گا، اور پھر ایسا ہی ہوا۔
- قرآن بائیبل کی اِن تمام باتوں کو رد کرتا ہے۔ ستاروں کو دیکھنے کے بارے میں بائیبل کے بیان کے برعکس قرآن کے بیان کے مطابق یہ اپنی جوانی کے دنوں میں ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کے ساتھ مناقشے کی ایک منظر کشی ہے۔ آپؑ نے بتوں پر نگاہ ڈالی اور کہا یہ تو تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشے ہیں، کس طرح اِنہیں خدا قرار دیتے ہو؟ آسمان کے ستاروں، چاند اور سورج کو اشارہ کیا اور کہا: یہ تو ڈوب جاتے ہیں میں ڈوبنے والوں کو خدا نہیں مانتا! پرندوں کے ذبح کرنے کے بارے میں فرماتا ہے: ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: خدایا! مجھے دکھادے کہ مردوں کو کس طرح دوبارہ زندہ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا دوبارہ زندہ ہونے پر یقین نہیں رکھتے؟ آپؑ نے کہا: یقین کیوں نہیں رکھتا، مگر چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا چار پرندے لو، اُنہیں اپنے ساتھ ہلالو، پھر بعض ایک اور بعض دوسرے اور بعض تیسرے پہاڑ پر رکھ دو اور پھر اُنہیں بُلالو کہ تمہارے پاس دوڑ کر آجائیں۔ اگر یہ پرندے تمہارے ایک اشارے پر تمہارے پاس دوڑ کر آتے ہیں، تو مردے بھی اسی طرح میرے ایک اشارے پر اپنی قبروں سے نکل کر میرے پاس آجائیں گے۔
- بائیبل اُس قربانی کے بارے میں جو لوگ اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں، کہتا ہے: جس قربانی کو اللہ قبول کرتا ہے، ایک شعلہ آکر اُسے جلا دیتا ہے۔ اسی طرح کہتا ہے: اِس قربانی کے خون سے معبد کے مخصوص حصے رنگے جائیں اور اِس کا ایک حصہ معبد کی ایک خاص جگہ میں جلا دیا جائے جبکہ گوشت کے سب سے لذیذ حصے معبد کے کاہن (اِن کے مولوی) کو دیئے جائیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ خدا کو نہ تو اِس قربانی کے خون کی ضرورت ہے اور نہ گوشت کی۔ اللہ کا حصہ فقیروں میں بانٹ دیں، یہ کاہن کا نہیں بلکہ فقیروں کا حصہ ہے۔ جس طرح کہ فرماتا ہے:

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَ لَادِمَآؤُهَا وَ لٰكِن يَنَالُه التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ 　الحج ۲۷

اللہ کو نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ ہی خون مگر تمہارا تقویٰ۔

اِسی طرح فرماتا ہے:

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ۔ 　الحج ۲۸

تو خود بھی کھاؤ اور بے کس فقیروں کو بھی کھلاؤ۔

مَّثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمۡوَٰلَهُمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنۢبُلَةٖ مِّاْئَةُ حَبَّةٖۗ وَٱللَّهُ يُضَٰعِفُ لِمَن يَشَآءُۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمۡوَٰلَهُمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُونَ مَآ أَنفَقُواْ مَنّٗا وَلَآ أَذٗى لَّهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾

(۲۶۱)۔ اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں؛ اُس دانے کی طرح ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہے مضاعف (نشو ونما) کر دیتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا صاحبِ وسعت ہے۔
(۲۶۲)۔ وہی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر اپنے انفاق کردہ مالوں کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دل آزاری کرتے ہیں۔ اُن کے لئے اپنے رب کے پاس اُن کا اجر ہے، نہ اُن کو کوئی خوف لاحق ہے اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہوں گے۔

(۲۶۱۔ ۲۶۲)۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو یہ عمل اُن کے دل و دماغ اور شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی بہت سی ناپسندیدہ اور خراب صفات و عادات اچھی اور قابلِ رشک صفات سے بدل دیتا ہے۔ حرص، بخل، مال کے ساتھ افراطی محبت، کبر، دولت کی بدولت برتری کا احساس، بے کس اور نادار کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور بہت سے دوسرے اخلاقی رذائل کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اِن کی جگہ ترحم، دلسوزی، ایثار، قناعت، رزقِ حلال پر اکتفا اور بہت سے دوسرے انسانی فضائل اور اخلاقی قدروں کی نشو و نما کرتا ہے۔ درج بالا آیت میں انفاق کے اِن اثرات کو اِس قدر گہرے اور وسیع قرار دیا گیا ہے جیسے ایک دانہ جو سات بالیں اُگائے اور ہر بالی میں سو سو دانے لگیں بلکہ اِس سے بھی زیادہ۔ یہ اِس لئے کہ اللہ خوب جاننے والا صاحبِ وسعت ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون اِس قابل ہے کہ اُس کے انفاق پر اِس سے بھی زیادہ نتائج مترتب کرے۔ مگر اِس شرط پر کہ انفاق کے بعد اُن لوگوں کی دل آزاری اور اذیت کا باعث نہ بنے جن کی مدد کر چکا ہے اور نہ ہی اُن پر احسان جتائے۔ اُنہیں حقیر نہ سمجھے، بار بار اپنے احسانات کی یاددہانی نہ کراتا رہے، یہ توقع نہ لگائے کہ مدد کی وجہ سے لوگ اُس کے ممنون رہیں گے اور اُس کی بڑائی کے معترف ہوں گے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے انفاق کرنے والوں کے بجائے اِس دانے کی تشبیہ انفاق کردہ مال کی طرف قرار دی ہے اور یہ مراد لیا ہے کہ اُن کا مال یا اجر اللہ تعالیٰ کئی کئی گنا بڑھا دے گا۔ مگر نہ صرف یہ کہ آیت کے الفاظ میں اِس کی گنجائش نظر نہیں آتی بلکہ یہ توجیہ آیت کے آخری حصے سے مطابقت بھی نہیں رکھتی۔ اگر یہاں پر انفاق کا اجر مراد ہوتا تو آیت کے آخر میں یہ تکرار نہ ہوتی کہ اُن کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ آیت کے الفاظ سے تو یہی مطلب

نکلتا ہے کہ خود منفق اور انفاق کرنے والے کو اُس دانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے،(مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ) کہا گیا ہے نہ کہ (مثل ما انفقوا)۔ اِس کے بعد آنے والی دو مثالوں میں بھی آپ دیکھ لیں گے کہ اِس مطلب کو مزید صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ریاکار منفِق کو سخت پتھر کے ساتھ اور مخلص منفق کو بلندی پر لگائے گئے شاداب باغ کے ساتھ تشبیہ دے کر اِن مثالوں میں انفاق کرنے والوں کی نشو و نما بیان کی گئی ہے نہ کہ اُن کے انفاق کی۔

۞ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَآ أَذًى ۗ وَٱللَّهُ غَنِىٌّ حَلِيمٌ ﴿٢٦٣﴾

(۲۶۳)۔ دلداری کا ایک کلمہ اور لغزشوں سے در گزر اُس صدقے سے کہیں بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو اور اللہ حلیم غنی ہے۔

(۲۶۳)۔ جس مدد کے بعد دل آزاری اور احسان جتانے کا رویہ لگا ہوا ہو اُس سے دلداری کا ایک کلمہ کہنا اور لغزشوں سے در گزر کرنا زیادہ بہتر ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿٢٦٤﴾

(۲۶۴)۔ اے ایمان والو! اپنے صدقات احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے باطل نہ کرو، اُن لوگوں کی طرح جو لوگوں کو دکھلانے کے لئے انفاق کرتے ہیں اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اُس شخص کی مثال اُس چکنے پتھر کی طرح ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اُس پر ایسی زوردار بارش برس جائے جو اُسے صاف اور چکنا کر کے رکھ دے۔ وہ اپنے اعمال سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر پائے گا اور اللہ ایسی کافر قوم کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

(۲۶۴)۔ یہاں اُن اِنفاق کرنے والوں، جن میں اِنفاق کا جذبہ اللہ اور آخرت پر ایمان کی بدولت نہیں بلکہ دکھاوے کے لئے اُبھرتا ہے، کی تشبیہ اُس چکنے پتھر سے دی گئی ہے جس پر کچھ مٹی جم گئی ہو۔ اُس کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ زرخیز زمین ہوگی اور کاشت کے لئے تیار ہے مگر جب ایک تیز بارش ہو جائے تو اوپر کی مٹی بہہ جاتی ہے اور اُس کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ریاکار

منفق ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُس کے انفاق سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس کے دل میں رحم اور عاطفت کے جذبات موجزن ہیں اور اُس کا اِنفاق ایمان اور عقیدے کے بنیاد پر ہے مگر بہت جلد اُس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اُس کے دل کی اصل کیفیت اُس کی دل آزاری اور احسان جتانے میں نظر آجاتی ہے جو اُس کے انفاق کے بعد کے سلوک سے ٹپکتی ہے۔ ایسے کافر الٰہی ہدایت سے محروم ہیں اور اِنفاق کرنے سے اُن کے جو مقاصد ہوتے ہیں اُن کے پورے ہونے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ اِس مثال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی مثال میں بھی تشبیہ منفق کی دی گئی تھی نہ کہ اُس کے انفاق کردہ مال کی۔

وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمُ ٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ٱللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَـَٔاتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

(۲۶۵)۔ اور مثال اُن لوگوں کی جو اپنے مال کا انفاق اللہ کی رضا کی تلاش میں اور اپنے نفس کے ثبات کی وجہ سے کرتے ہیں، اونچے قطعہ زمین پر واقع اُس باغ کی مانند ہے جس پر اگر زوردار بارش ہو جائے تو دگنا بار لے آتا ہے اور اگر زوردار بارش نہ برسے تو اوس (تو ہے ہی)، اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

(۲۶۵)۔ وہ جن کا انفاق اللہ کی رضا کے لئے ہوتا ہے اور راسخ ایمان اُن کو انفاق پر اُبھارتا ہے، اُن کی مثال اُس باغ کی مانند ہے جو بلند قطعہ زمین پر واقع ہوتا ہے۔ اُس کے پودوں کی جڑیں اونچی زمین کی نرم مٹی میں گہری اُتری ہوئی ہوتی ہیں، اگر تیز بارش ملے تو دگنا بار لے آتے ہیں اور اگر تیز بارش نہ بھی ہو تو نرم بارش اور صرف شبنم بھی اُس کے لئے کافی ہوتی ہے۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُۥ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ لَهُۥ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ وَأَصَابَهُ ٱلْكِبَرُ وَلَهُۥ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَٱحْتَرَقَتْ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْـَٔايَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

(۲۶۶)۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایسا باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور اُس میں اُس کے لئے ہر طرح کے (اور) پھل بھی ہوں اور وہ خود بوڑھا ہو رہا ہو جبکہ اُس کے بچے ابھی کمزور ہوں مگر ناگہاں ایک زور کی آندھی اُس کے باغ پر آجائے جس میں آگ بھی ہو اور باغ کو جلا کر رکھ دے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لئے ایسی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم تفکر کرو۔

---

(۲۶۶)۔ ریاکاری، احسان جتانے اور مسکینوں کو اذیتیں دے کر اپنے نیک اعمال اور انفاق سے تیار کیا گیا وہ باغ جس کی سخت دنوں میں تمہیں شدید ضرورت پڑے گی، اپنے ہاتھوں نہ جلاؤ۔ نہیں؛ تو تمہاری مثال اُس شخص کی ہو گی جس کا باغ احتیاج کے دنوں میں سخت لو کی آندھی سے جل جائے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُواْ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

(۲۶۷)۔ اے ایمان والو! اپنے ہاتھوں سے کمائی گئی چیزوں اور اُن چیزوں میں سے جو ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالیں، پاکیزہ پاکیزہ انفاق کیا کرو اور اُن ناپاک (چیزوں) کا قصد نہ کرو جو دوسروں کو تو دیتے ہو مگر خود لینے پر تیار نہیں ہو جب تک صرفِ نظر نہ کر لو اور (ہاں) جان لو کہ اللہ ستودہ صفات (حمید) غنی ہے۔

---

(۲۶۷)۔ اپنے حلال مال میں سے پاکیزہ چیزیں اللہ کی راہ میں دیں، نہ کہ وہ ردی اور ناپاک چیزیں جو اگر آپ کو کوئی دے دے تو لینے سے انکار کر دیں اِلّا یہ کہ اغماض برت جائیں۔ اللہ کو تمہارے اِنفاق کی حاجت نہیں ہے، وہ غنی ہے اور اِس سے بالاتر ہے کہ ناپاک اور ردی چیزیں قبول کرلے۔

ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾

(۲۶۸)۔ شیطان تمہیں فقر دکھاتا ہے اور فحاشی پر اُبھارتا ہے اور اللہ تمہارے ساتھ اپنی مغفرت اور نوازش کا دعدہ کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا صاحبِ وسعت ہے۔

(۲۶۸)۔ شیطان تمہیں غریبی اور فقر سے ڈراتا ہے۔ بخل کی تلقین کرتا ہے اور اُسے مزین کرکے دکھاتا ہے۔ مگر اللہ تمہیں انفاق کی طرف بلاتا ہے اور اُس کے بدلے اپنی مغفرت، بخشش اور نوازش کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کون شیطانی القائت کے زیرِ اثر ہے، فقر سے خوفزدہ ہے اور انفاق سے پہلو تہی کرتا ہے اور کون اللہ کے بلاوے پر لبیک کہتا ہے اور انفاق کرکے اُس کی مغفرت اور فضل کا متلاشی ہے۔

يُؤْتِى ٱلْحِكْمَةَ مَن يَشَآءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِىَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿٢٦٩﴾

(۲۶۹)۔ جس کو چاہے حکمت سے نواز دیتا ہے اور جس کسی کو حکمت دی گئی تو اُسے یقیناً خیرِ کثیر عطا کی گئی اور عقل والوں کے علاوہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔

(۲۶۹)۔ وہی حکمت والا ہے جو اللہ کی پکار پر لبیک کہے، اللہ کے فضل اور مغفرت کی تلاش میں ہو اور اِسی کے حصول کے لئے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ جس کو یہ حکمت دی گئی اُسے درحقیقت عظیم بھلائی اور خیرِ کثیر حاصل ہوئی۔

وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُهُۥ ۗ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٢٧٠﴾

(۲۷۰)۔ اور تم نے جو کچھ انفاق کیا ہے اور جو بھی نذرمان کر پوری کر دی ہے، تو اللہ اُسے جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی دستگیر نہیں ہے۔

(۲۷۰)۔ جو نذر تم اپنے اوپر (لازم) مان لیتے ہو اور جو صدقہ تم دیتے ہو، وہ چاہے کم ہے یا زیادہ، اچھی نیت سے ہے یا بری نیت سے، حلال مال سے ہے یا حرام مال سے، اللہ اُسے جانتا ہے۔ اگر تم نے انفاق اور نذر کے معاملے میں غلط راستہ اختیار کیا اور زیادتی کے مرتکب ہوئے تو جان لو کہ ظالموں کو کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ کسی اچھے اور جائز کام کے انجام پا جانے کی اُمید میں اللہ کے نام پر کوئی نذر اپنے اوپر لازم کر لینا جائز ہے۔ مگر یاد رکھیں نذر کے بارے میں پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں: "نذر کی بدولت اللہ تعالیٰ بخیل آدمی کے پلے سے کچھ خرچ کروانا چاہتا ہے"۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے بھی بغیر کسی شرط کے کچھ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ اُن کا بخل ہی ہے کہ

کسی ایک حاجت کے پورے ہونے پر اپنے ذمے کوئی نذر مان لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہ یہ کام ہو جائے تو یہ اور یہ انفاق کر دوں گا۔

إِن تُبْدُواْ ٱلصَّدَقَٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا ٱلْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾

(۲۷۱)۔ اگر صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر فقراء کو دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور اِس کی بدولت اللہ تمہارے بعض سیئات ختم کر دے گا اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب خبر دار ہے۔

(۲۷۱)۔ تمہارا معاملہ اُس اللہ کے ساتھ ہے جو ہر چیز سے خوب خبر دار اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو کچھ آپ کسی مسکین کو اِس وجہ سے چھپ چھپا کر دیتے ہیں کہ اُس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور تمہارے انفاق میں ریا اور خود نمائی کا کوئی شائبہ نہ آجائے تو اُس کے بدولت اللہ تمہاری کچھ سیئات مٹا دے گا۔ تمہاری بُری عادات، بُرے اخلاق اور بُرے کرتوت کھُرچ ڈالے گا۔ تغفیر الذنوب کا معنٰی گناہوں کا بخش دینا اور تکفیر السیئات کا معنٰی بُرے اخلاق کا ازالہ ہے۔ انفاق کے ذریعے بخل اور حرص کی طرح کے بہت سے ناپسندیدہ اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے۔ تمہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ تمہاری ہر نذر اور انفاق کو اللہ جانتا ہے۔

لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَىٰهُمْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَهْدِى مَن يَشَآءُ ۗ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ٱبْتِغَآءَ وَجْهِ ٱللَّهِ ۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾

(۲۷۲)۔ تم پر اِن کی ہدایت فرض نہیں کی گئی ہے، یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے۔ اور اپنے مال سے اگر کچھ انفاق کرو تو یہ خود تمہارا (فائدہ) ہے اور تم تو انفاق سے سوائے رضائے الٰہی کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ اور اپنے مال سے جو کچھ بھی تم انفاق کر دو؛ پورا (واپس) مل جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہو گا۔

(۲۷۲)۔ کسی کو راہِ راست پر چلانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ تمہارا نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے کہ دیکھ لے کہ کس میں راہِ راست پر چلنے کی صلاحیت موجود ہے؛ توفیق وہ اُسی کو دے دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایمان لانے نہ لانے کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی

مسکین سے اپنی مدد روک لو کہ کیوں ایمان نہیں لایا اور ہدایت یاب نہیں ہوا۔ ہر انفاق کا فائدہ دوسروں سے قبل خود تم پر مترتب ہوتا ہے۔ تم انفاق کرکے اللہ کی رضا کے طالب بنتے ہو؛ تو بے فکر رہو تمہارا ثواب مکمل طور پر تمہیں ملے گا۔

لِلْفُقَرَآءِ ٱلَّذِينَ أُحْصِرُواْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِى ٱلْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ ٱلْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ﴿٢٧٣﴾

(۲۷۳)۔ (انفاق) اُن فقراء کے لئے ہونا چاہیے جو اللہ کی راہ میں مصروف کئے گئے ہیں، زمین پر (کاروبار کے لئے) نقل و حرکت سے لاچار ہیں، عفاف (نہ مانگنے) کی وجہ سے جاہل اور ناسمجھ انسان اُن کو غنی سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کے حلیے سے تم اُنہیں پہچان لوگے، لوگوں سے اصرار کرکے کچھ نہیں مانگتے اور تم جو کچھ انفاق کرتے ہو اللہ اُسے اچھی طرح جانتا ہے۔

(۲۷۳)۔ مدد کے اصل مستحق وہ مجاہدین ہیں جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسری ہر مصروفیت سے دست کش ہیں۔ رات دن دین کی خدمت میں مصروف ہیں اور تجارت اور مال و دولت کمانے کے لئے سفر پر نکلنے سے مجبور ہیں۔ اگرچہ محتاج ہیں مگر بلند ہمت ہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے پر تیار نہیں ہیں تاکہ مدد مانگ لیں۔ اُن کی یہ پرہیز، قناعت اور عفافیت (خودداری) دیکھ کر ناسمجھ لوگ اُن کو غنی اور مالدار سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کے حلیے اور خدوخال سے تم اُنہیں پہچان لوگے اِس لئے کہ اُن کے چہروں پر لکھے ہوئے بھوک کے سنگ سنگ تمہیں وقار اور اوپر دی گئی صفات کی نشانیاں نظر آجائیں گی۔ چاہے کتنے ہی مجبور کیوں نہ ہوں الحاح وزاری اور تاکید و اصرار کے ساتھ کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ محتاج اگر کافر بھی ہو تو اُس کے ساتھ مدد کرسکتے ہو مگر مدد کے اصل مستحق یہ لوگ ہیں۔

ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُم بِٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ ۗ وَأَحَلَّ

ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ ۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾

(۲۷۴)۔ وہ جو رات دن چھپے اور علانیہ اپنے مال انفاق کرتے ہیں تو اُن کا اجر اپنے رب کے پاس (محفوظ) ہے، اُن پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ (۲۷۵) (مگر) وہ، جو سود کھاتے ہیں (قیامت کے دن)، نہیں اُٹھیں گے مگر اُن لوگوں کی طرح جنہیں شیطان نے چُھو کر اُن کے حواس مختل کر دیئے ہوں، یہ اِس لئے کہ کہتے ہیں: بیع (تجارت) بھی سود کی مانند ہے! حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جسے اپنے رب کی طرف سے نصیحت آگئی اور وہ باز آیا، تو جو گزر چکا وہ اُس کے لئے ہے اور اُس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جس نے دوبارہ ارتکاب کیا تو وہ دوزخی ہیں، اُس میں ہمیشہ رہنے والے۔

(۲۷۴۔۲۷۵)۔ جو لوگ اپنے مال چھپے اور علانیہ دن رات اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں؛ اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ اُن کے لئے نہ تو خوف کا کوئی مقام ہے اور نہ اُنہیں کوئی رنج و ملال ہو گا۔ مگر جو سود کھاتا ہے وہ درحقیقت ایک مخبوط الحواس انسان ہے جس کے حواس شیطان نے گڈمڈ کر رکھے ہیں۔ مال کے ساتھ افراطی محبت اور زیادہ مال کمانے کی شدید حرص نے اُسے پاگل پن کی حد تک پہنچایا ہے۔ اُس کے فکر کی کجی ملاحظہ کریں، سود اور بیع کو ایک جیسا قرار دیتا ہے۔ اُس کا ذہن شیطانی خیالات کے زیرِ اثر آگیا ہے اور اُس کے ذہن پر شیطان سوار ہے جبھی تو کہتا ہے کہ بیع اور تجارت میں بھی ایک دوسرے سے منافع کمایا جاتا ہے تو اگر سود میں یہی کام کیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ شیطانی استدلال ایسا ہی ہوتا ہے، گہرے فرق کو نظر انداز کر کے ظاہری شکل و صورت کی یکسانیت کو سامنے رکھ کر اُس سے استناد کرنا شیطان اور اُس کے زیرِ اثر انسانوں کی خصلت ہے۔ ہر سلیم الفطرت انسان جانتا ہے کہ سود میں ایک بے کس کی مجبوری کا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ ایک طرف سرمائے کا مالک ہوتا ہے جو کسی محنت کے بغیر یقینی اور حتمی فائدے کا مُستحق ٹھہرتا ہے جبکہ دوسری طرف ایک مجبور بے کس انسان جسے اپنی مجبوریوں نے اِس معاملے پر تیار کیا ہے اور سوائے نقصان کے اُس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اِس سارے سودے میں جو کچھ اُس کے ہاتھ آتا ہے اُسے یا تو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے پر خرچ کرتا ہے اور یا کسی ایسے کام میں جس میں پسینہ اُس کا بہے اور حاصل سود خوار سرمایہ دار کی جیب میں چلا جائے۔ سود اُس سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد کا سب سے بھاری پتھر ہے جس میں لوگ دو گروہوں میں بانٹے گئے ہیں۔ ایک طرف سوسائٹی کے سارے وسائل کے مالک اور دوسری طرف دن رات کام میں جتے ہوئے، اپنے ہاتھوں کے چھالوں اور پسینے کی قیمت سے پیدا کردہ محصولات اِن سرمایہ داروں کے قدموں میں نچھاور کرنے والے بے کس اور نادار انسان۔ اِس نظام میں سرمایہ دار حاکم ہے، حکومت کے تمام ادارے اُس کے ہاتھوں میں ہیں اور تمام انفرادی اور اجتماعی اُصول و قوانین اُس کی خدمت پر مامور ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، امریکہ کا موجودہ نظام اِس کا بہترین نمونہ ہے۔ وہاں بڑی بڑی کمپنیوں، کنسور شیم اور وسیع جائیداد کے مالکان امریکہ اور اُس کے تمام خزانوں کے حاکم ہیں۔ ملک کی نوے

فیصد دولت ملک کے پانچ فیصد دولتمندوں کے ہاتھ میں ہے۔ اِن پانچ فیصد دولتمندوں کی مرضی کے بغیر نہ کوئی رئیسِ جمہور بن سکتا ہے، نہ کوئی کسی صوبے کا گورنر اور نہ ہی کانگریس اور پارلیمان کا ممبر۔ اقوامِ متحدہ کے سال(۲۰۰۵ء) کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کے ۳۴ ملین باشندے فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے ہیں، یعنی ہر سات امریکیوں میں سے ایک۔ اِن کا کوئی کام کاج نہیں ہے جبکہ حال یہ ہے کہ امریکہ نے دنیا کے متعدد ممالک کی اقتصادیات اپنے استعماری پنجوں میں جکڑ رکھی ہیں اور ہر سال اِن کالونیوں سے اربوں ڈالر بٹورتا ہے۔ یہاں اور وہاں جنگ کی آگ بڑھکا کر ایک طرف اپنے اسلحے کے لئے منڈیاں پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف اُن شورش زدہ ممالک میں ڈر، خوف اور بدامنی کی ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ اُن کے صاحب ثروت حاکم، تاجر اور سرمایہ دار ملک سے اپنی دولت نکالنے کے لئے امریکہ کے بینکوں کا رخ کر لیتے ہیں۔ امریکہ کے بہت سارے بینکوں کے سرمائے کا زیادہ تر حصہ اُس دولت پر مشتمل ہے جو عرب شیوخ وہاں پر منتقل کر چکے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ درج بالا آیت کے اِس حصے (يَتَخَبَّطُه الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ) کا معنٰی یہ نہیں ہے کہ کسی مجسم یا غیر مجسم شیطان نے اپنا ہاتھ اُس پر پھیر دیا ہے یا عوام کی اصطلاح میں کوئی جن اُس پر آگیا ہے اور ہاتھ پھیرنے یا جن آنے کے نتیجے میں اُسے سرسام ہو گیا ہے۔ بلکہ اِس طرح کہہ کر شیطان کی تلقین یا انسان کے دل و دماغ کا اُس کے وسوسوں کے زیرِ اثر آنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن ایک اور جگہ متقین کا ذکر کرتے ہوئے بھی، اِس بارے میں یوں فرماتا ہے:

اِنَّ ا لَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسهُمْ طٰئفٌ مِنَ الشيطٰنِ تَذَكرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ۔ الاعراف:۲۰۱

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ کیا، جب اُن کا طواف کرنے والے شیطانوں میں سے کوئی اُسے چھو لیتا ہے (کوئی شیطانی تلقین کر لیتا ہے) تو وہ فوراً متوجہ ہو جاتا ہے، اور اُسی وقت صاحبِ بصیرت اور راہِ راست کے پہچان کے قابل ہو جاتا ہے۔

جس کسی نے سود کے بارے میں اللہ کا حکم سن لیا اور اُس کے بعد باز آیا، تو وہ پہلے لئے گئے سود پر اکتفا کر لے اور اپنے باقی ماندہ قرضوں میں سے صرف اصل زر کا تقاضا کرے نہ کہ اُس کے سود کا؛ گزشتہ کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ امید ہے اللہ اُسے معاف فرمائے گا۔ مگر جو کوئی سود کی تحریم کے بعد بھی سودی معاملات میں آلودہ رہتا ہے وہ دوزخی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ آیت کے آخری حصے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سود کتنا بڑا گناہ ہے۔

يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

---

(۲۷۶)۔ اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کی نشوونما کرتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ (۲۷۷)۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک اعمال کئے، نمازیں ادا کیں، اور زکوٰۃ ادا کی، اُن کے لئے اُن کا اجر محفوظ ہے، اُن کے رب کے پاس؛ نہ اُن کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۲۷۶۔۲۷۷)۔ سود تباہی کا وسیلہ ہے اور صدقہ وسعت اور نشوونما کا باعث بنتا ہے۔ سود کے ساتھ منافع بھی تباہ ہوتا ہے اور اصل زر بھی اور صدقہ کے ساتھ اللہ تمہارے مال میں بھی برکت ڈال دے گا اور خود صدقات اور اُن کے اجر و ثواب میں بھی۔ سود پتھر دل کافروں اور سخت گناہگاروں کا کام ہے اِس سے دور رہیں، اِس لئے کہ یہ اللہ کو ناپسند ہے۔ اِس کے برعکس وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اچھے اعمال کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور بجائے سود کھانے کے، زکواۃ ادا کرتے ہیں، اللہ اُن کے اجر کی ضمانت دیتا ہے۔ اُن کے لئے نہ کوئی ملال ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ فَأۡذَنُواْ بِحَرۡبٖ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦۖ وَإِن تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوسُ أَمۡوَٰلِكُمۡ لَا تَظۡلِمُونَ وَلَا تُظۡلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسۡرَةٖ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيۡسَرَةٖۚ وَأَن تَصَدَّقُواْ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَٱتَّقُواْ يَوۡمٗا تُرۡجَعُونَ فِيهِ إِلَى ٱللَّهِۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفۡسٖ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

(۲۷۸)۔ اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو اور بقایا سود چھوڑ دو، اگر ایمان رکھتے ہو۔ (۲۷۹)۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو اللہ اور پیغمبر کا تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور اگر توبہ کر لو، تو پھر تمہارا راس المال (اصل زر محفوظ) ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ (۲۸۰)۔ اور اگر (قرضدار) تنگ دستی کا شکار ہو تو پھر اُس کے ہاتھ کھلنے تک کا انتظار کرو۔ اور اگر صدقہ کر دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر سمجھ سکو۔ (۲۸۱)۔ اور اُس دن سے ڈرو جس دن اللہ کے حضور پلٹنا ہے، پھر ہر کسی کو اُس کے اپنے ہاتھ کی کمائی پوری کی پوری دے دی جائے گی اور اُس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(۲۷۸۔۲۸۱)۔ اگر واقعی ایمان رکھتے ہو تو سود سے اجتناب کرو۔ سود کھانا ایمان سے متصادم ایک عمل، اور اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا سود کھانے والے اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار رہیں۔ جو نظام سود پر قائم ہوتا

ہے وہ اللہ سے باغی نظام ہے۔ اِن مبارک آیات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سود پر قائم نظام کو ضرور جنگ کی آگ میں جھونکے گا۔ سود پر قائم معاشرہ رفتہ رفتہ اُس مقام پر پہنچے گا کہ اُس کی تمام ثروت چند محدود سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے گی اور اکثریت فقر و مسکنت اور بھوک کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ مالدار دن بہ دن مزید مالدار اور نادار مزید نادار ہوتا چلا جائے گا۔ یہ صورتحال اِن دونوں طبقوں میں بغض اور نفرت کی ایسی فضا پیدا کر دے گی جس میں مظلوم طبقہ بالاتر طبقے کے خلاف اسلحہ اُٹھانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں پاتا۔ اِس طرح لڑائیوں کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور یہ علیم اللہ کی اِس بات کا مصداق ہے کہ سود خور اللہ اور رسول کی جانب سے لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔ اِس مبارک آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر سود کھانے والے سود سے دست کش نہ ہوں تو اسلامی حکومت اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کا مکلف ہے۔

سود دراصل ایک مجبور انسان کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا نام ہے۔ قرض دینے کی صورت میں جنس کے مقابلے میں زیادہ جنس اور رقم کے مقابلے میں زیادہ رقم وصول کرنا سود ہے۔ لیکن اگر سود خور حیلہ تراش لے اور رقم کی بجائے جنس دیکر قرضدار کو کہے کہ رقم تو نہیں ہے جنس لے لو۔ بازار میں اِس کی قیمت دس روپے ہے تم مجھے اگلے سال بارہ روپے دے دینا اور قرض دار وہ جنس بازار لے جا کر دس روپے کے عوض رقم میں بدل ڈالے تو بظاہر تو معاملہ ایسا لگتا ہے کہ جنس قرض بیچی جارہی ہے مگر درحقیقت ایک نے سود پر رقم وصول کی اور دوسرے نے سود پر رقم دی۔ بہت سے سود خور ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِس طرح اُنہوں نے سود بھی وصول کر لیا اور گناہ سے بھی بچ گئے۔ بعض لوگوں نے باقاعدہ اِس طرح کے فتوے دے دے کر سود خوروں کی مشکل حل کر کے اُنہیں "حرام سود" کے بدلے "حلال سود" پر لگا دیا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ایسے حیلوں سے حرام حلال قرار پا جائے گا۔ حلال و حرام کے فیصلے ظاہری شکلوں کی بناء پر نہیں بلکہ معاملے کی تہہ اور حقیقت اور انسان کے لئے اُس کے نافع اور مضر ہونے کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ کسی حرام کام کو حلال کا جامہ پہنا کر، اُس کے ظاہر کو حلال کی طرح بنانے سے وہ کبھی حلال نہیں ہو جایا کرتا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ وَلۡيَكۡتُب بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبُۢ بِٱلۡعَدۡلِۚ وَلَا يَأۡبَ كَاتِبٌ أَن يَكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُۚ فَلۡيَكۡتُبۡ وَلۡيُمۡلِلِ ٱلَّذِي عَلَيۡهِ ٱلۡحَقُّ وَلۡيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـٔٗاۚ فَإِن كَانَ ٱلَّذِي عَلَيۡهِ ٱلۡحَقُّ سَفِيهًا أَوۡ ضَعِيفًا أَوۡ لَا يَسۡتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهُۥ بِٱلۡعَدۡلِۚ وَٱسۡتَشۡهِدُواْ شَهِيدَيۡنِ مِن رِّجَالِكُمۡۖ فَإِن لَّمۡ يَكُونَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٞ وَٱمۡرَأَتَانِ مِمَّن تَرۡضَوۡنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحۡدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحۡدَىٰهُمَا ٱلۡأُخۡرَىٰۚ وَلَا يَأۡبَ ٱلشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُواْۚ وَلَا تَسۡـَٔمُوٓاْ أَن

تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ
إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ
وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا
اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ ۞ وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا
فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا
تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

(۲۸۲)۔اے ایمان والو! جب ایک دوسرے کے ساتھ ایک مقررہ مدت تک قرض کا لین دین کرنے لگو، تو اُسے لکھ لیا کرو۔ کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ تمہارے لئے اِسے لکھ لیا کرے۔ اور کوئی کاتب لکھنے سے پہلو تہی نہ کرے، اُسے چاہیے کہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے اُسی طرح لکھ لے۔ بیان وہ فریق لکھوائے جس پر حق آرہا (قرضدار) ہے اور اپنے رب کا خوف رکھے اور کوئی چیز کم نہ بتائے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آرہا ہے ناسمجھ یا ضعیف ہے اور یا اِملا نہیں کرا سکتا تو اُس کا ولی عادلانہ اِملا کرائے۔ اور اپنے مَردوں میں سے دو گواہ مقرر کر لو اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر تمہاری پسند کے گواہوں میں سے ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہئیں کہ اگر اِن دونوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلائے۔ اور جب گواہ (گواہی کے لئے) بُلائے جائیں تو پہلو تہی نہ کریں اور معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اِس کی دستاویز لکھنے میں تساہل نہ کرو۔ یہ طریقہ اللہ کے نزدیک زیادہ عادلانہ ہے اور گواہی کو مضبوط بناتا ہے اور آپس کے شک سے بچانے والا ہے، ہاں اگر حاضر (موقع پر) تجارت ہو جس میں دست بدست لین دین ہو جائے تو پھر تم پر نہ لکھنے میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن جب آپس میں بیع طے کرو تو بیچ میں شاہد رکھا کرو۔ نہ لکھنے والے کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ گواہوں کو، اور اگر کبھی ایسا کر لیا تو یہ تمہارا فسق اور گناہ گنا جائے گا، اور اللہ سے ڈرو، اللہ تو تمہیں درست تعلیم دیتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا خوب علم ہے۔(۲۸۳) اور اگر سفر میں ہوں اور کوئی کاتب نہ ملے تو پھر رہن بالقبضہ ہے اور اگر تم میں سے کوئی دوسرے ساتھی کو امین جان لے (اُس پر اعتماد کر کے معاملہ کرے) تو امین اُس کی امانت کو بحفاظت لوٹا دے اور اپنے رب' اللہ کا خوف رکھے، اور گواہیاں نہ چھپاؤ۔ اور جس نے چھپائی تو بے شک اُس کا دل گناہ آلودہ ہو گیا اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

(۲۸۲)۔اِن مبارک آیات میں چند اہم نکات خصوصی اہمیت کے حامل اور قابل توجہ ہیں:

- سود حرام کیا گیا ہے، قرض کے بدلے میں کسی سے منافع حاصل کرنا منع ہے اِس کے بجائے ایک دوسرے کو بلا سود قرض دیا کریں۔
- قرض کے لین دین میں وہ تمام ضروری تدابیر اختیار کی جائیں جو تنازعات، مسائل، اختلافات، ایک دوسرے کے تنگ کرنے اور فریقین کی حق تلفی کے تدارک کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ قرض کی مقدار اور مدت لکھ دی جائے۔ تحریر کی اِملا قرض لینے والا کرائے اور اگر وہ اِس سے عاجز ہے تو اُس کا وکیل اور ولی یہ کام کرے۔ کاتب دقتِ نظر، احتیاط اور عدل کے ساتھ دستاویز لکھے، کسی کی طرفداری نہ کرے اور تحریر پر گواہ مقرر کرے۔ بہتر یہ ہے کہ دو مرد گواہ بنائے جائیں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو فریقین کی رضامندی سے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلائے تاہم اگر آمنے سامنے دست بدست تجارت ہے تو شاہد رکھ لیا کریں۔ اگر حالتِ سفر میں ہو جہاں نہ کاتب ملتا ہے اور نہ شاہد تو کوئی چیز بطورِ رہن قبضے میں لے سکتے ہو لیکن اگر ایک نے دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے بدون رہن کے قرض دے دیا تو قرض دار اللہ کا خوف کرے اور وقت پر امانت لوٹا دے۔

(۲۸۳)۔ یہاں رہن کی صورت بیان کی گئی ہے، سفر کے دوران، کاتب کی غیر موجودگی کی صورت میں کسی کو قرض کی ضرورت پڑ جائے تو قرض دے دیں اور قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور امانت اپنے قبضے میں لے لیں۔ یہ ضمانت کے لئے ہے اور جب وہ قرض ادا کر دے تو اُس کی امانت واپس کر دیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اِس جواز کو بھی سود خوروں نے سود کے لئے حیلہ بنایا ہوا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ رہن ایک امانت ہے اُس سے فائدہ اُٹھانا ناجائز اور سود کی مانند ہے مگر سود خور اِس سے اُسی طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں جس طرح نقد رقم سے اُٹھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل کئی ممالک میں رواج پڑ گیا ہے کہ مال دار لوگ زمینیں خریدتے ہیں، اُن پر مکان تعمیر کرتے ہیں اور وہ گھر کی اصل قیمت سے کم پر کسی ایسے شخص کو رہن دے دیتے ہیں جو اُس گھر میں کرایہ دیئے بغیر رہنا چاہتا ہے۔ گھر کا مالک رہن کے نام پر لی گئی رقم دوسرے کاروبار میں لگا دیتا ہے مثلاً دو گھر رہن دے کر اُن کے رقم سے تیسرا گھر بنالیتا ہے اور اِس طرح سود کی دوسری ہر شکل سے زیادہ رقم کما لیتا ہے۔ کئی لوگ بنکوں سے سود پر قرض لے کر اُن سے گھر تعمیر کرتے ہیں اور اُنہیں رہن دے دیتے ہیں۔ ایران میں گھروں کے مالک کرایہ پر گھر اُٹھانے کے بجائے اکثر اُنہیں رہن دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ در حقیقت ایک حرام کام کو حلال کی شکل دینا ہے۔

ملاحظہ کریں کہ اسلام نے معاملات کے بارے میں کتنی باریک بینی سے کام لیا ہے اور کس طرح معاملے کے ہر پہلو پر نظر رکھ کر دقیق رہنمائیاں فراہم کی ہیں۔ چاہیئے کہ یہ رہنمائیاں مسلمانوں کے تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کے لئے بنیاد فراہم کریں اور اِنہی کی روشنی میں وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کریں۔ اگر قرض اور دست بدست بیع اور لین دین کے بارے میں اسلام اتنی باریک بینی اور تاکید سے کام لیتا ہے تو دوسرے بڑے بڑے اجتماعی مسائل کے بارے میں اُس کے تقاضے اور رہنمائیاں کیا ہوں گی؟

دو متفق علیہ مرد گواہ نہ ملنے کی صورت میں ایک مرد اور دو زنانہ گواہوں کے مقرر کرنے کی دلیل بھی خود قرآن نے بیان فرمادی ہے اور کہا ہے کہ یہ صرف اِس لئے ہے کہ اگر ایک عورت بات بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلائے۔ یہ انتظام اِس لئے کیا گیا ہے کہ خواتین کا عاطفہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ اُن کے حافظے پر بھی اثرانداز ہو جاتا ہے۔ غور کریں کہ اُن کا عاطفہ اولاد کی ساری گمراہیاں، غلط کاریاں حتیٰ کہ ساری جفائیں اُسے بھلا دیتا ہے۔ ہر ماں کو اپنی اولاد انتہائی بے گناہ اور معصوم لگتی ہے، اُس کا بیٹا ہمسائے کے بیٹے کے ساتھ لڑائی میں سراسر قصوروار ہوتا ہے مگر یہ حق وناحق اُس کا دفاع کر رہی ہوتی ہے اُس کی ممتا اُسے اپنے بیٹے کے دفاع پر مجبور کرتی ہے۔ یہی عاطفہ بے کس قرضدار کے بارے میں گواہی کے دوران اُس سے وہی کچھ کرواسکتا ہے جو اُس کے بیٹے کے دفاع کے وقت اُس سے کرواتا ہے۔

وہ ناسمجھ لوگ جو اِس بات کو عورت کے حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں، اتنا بھی نہیں جانتے کہ گواہی کوئی امتیاز نہیں بلکہ ذمہ داری ہے اور اسلام نے ہر موقع پر مکلف بنانے کے بجائے عورت کو امتیازات دے رکھے ہیں، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

- محاذ پر جانے سے معاف رکھی گئی ہے اِلا یہ کہ نفیرِ عام ہو اور وہ اپنی مرضی سے جانا چاہے۔
- مسجد میں جانے کا حق دیا گیا ہے مگر مکلف نہیں کی گئی ہے۔
- نکاح مرد اور عورت کے لئے برابر درجے کا معاملہ ہے اور دونوں کے لئے ایک ہی درجہ کی طبیعی اور انسانی ضرورت کا تقاضا ہے مگر اسلام نے مرد کو مہر کی ادائیگی کا مکلف قرار دیا ہے۔ گھر اور گھرانے کے تمام مصارف اور اپنے بیوی اور بچوں کا نان نفقہ مرد کے ذمے لگایا ہے اور عورت کو اِس ذمہ داری سے معاف رکھا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے شوہر سے مہر لیتی ہے، بشمول شوہر کے تمام رشتہ داروں سے میراث میں حصہ پاتی ہے اور اِس پر مستزاد اُسے یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ اپنے اِس پس انداز کو جس طرح چاہے کاروبار میں لگا کر منافع بھی وصول کرلے۔ دیکھیں اقتصادی معاملات میں بھی مکلف کسی چیز کی نہیں بنائی گئی جبکہ اختیار پورا دیا گیا ہے۔

لِّلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا۟ مَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ ٱللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾ ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِۦ وَٱلْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِۦ ۚ وَقَالُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ

رَبَّنَا وَإِلَيْكَ ٱلْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا ٱكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ ۖ وَٱعْفُ عَنَّا وَٱغْفِرْ لَنَا وَٱرْحَمْنَآ ۚ أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

(۲۸۴)۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اللہ کا ہے۔ اور تم اپنے دل کی باتیں اگر ظاہر کرو یا اُنہیں چھپاؤ، اللہ تم سے اُن کا حساب لے گا، تو جس کے لئے چاہے گا معاف فرما دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے دے گا اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ (۲۸۵) پیغمبر اُس چیز پر یقین رکھتا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے اُس پر نازل ہوئی ہے اور مومنین بھی۔ تمام اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں، (اُن کا قول ہے کہ) ہم اُس کے پیغمبروں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔ اور اُنہوں نے کہا: ہم نے سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تمہاری بخشش کے طلبگار ہیں اور تمہاری طرف ہمارا لوٹنا ہے۔ (۲۸۶) اللہ کسی پر اُس کے مقدرت (استطاعت) سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ ہر ایک کے لئے اُس کی اپنی کمائی ہے اور اُس پر اُس کے اپنے اعمال (کا بوجھ)۔ اے ہمارے رب! بھول چوک پر ہمارا مواخذہ نہ کرنا یا کوئی خطا اگر ہم سے ہو جائے۔ اے ہمارے رب! ہم پر ویسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جو ہم سے پہلے لوگوں پر تو نے ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مولیٰ ہے پس ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔

(۲۸۴۔۲۸۶)۔ ہر کسی کا حساب ہو گا۔ نہ صرف اُس کے اعمال کا بلکہ اُس کے دل میں چھپے عزائم اور اسرار کا بھی، چاہے اُس نے چھپا کر رکھے ہوں یا ظاہر کئے ہوں۔ پھر جس کسی میں اللہ کے نزدیک بخشے جانے کی گنجائش اور قابلیت موجود ہو گی اللہ تعالیٰ اُسے بخش دے گا اور جو عذاب کا مستحق ہو گا اُسے سزا دے گا۔ اِس مبارک آیت کے نازل ہونے پر مومنین سخت خوفزدہ ہو کر پیغمبر علیہ السلام کے پاس پہنچے اور کہا: اگر ایسا ہو کہ ہمارے ساتھ دل کی باتوں اور اُن عزائم کا بھی حساب ہو جن کا دل میں صرف خیال گزرا ہو اور ہم نے اُن پر عمل نہ کیا ہو تو ہمارے لئے تو پھر ہلاکت ہی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: ہاں اِس کا بھی محاسبہ ضرور ہو گا، مگر جس کے دل میں گناہ کا ارادہ پیدا ہو اور وہ اُس پر عمل کرنے سے رُک جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک نیکی کے طور پر شمار کر

دے گا۔ اگر عمل کر بیٹھا تو اُسی ایک گناہ کے مناسب سزا دے گا لیکن اگر نیک ارادہ کرے اور اُس پر عمل نہ کر سکے تو اُس کو ادا کردہ نیکی کے برابر لکھے گا اور اگر عمل کر گزرے گا تو دس نیکیاں حساب ہوں گی اور دس گنا ثواب دے گا۔

آخری آیت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مومنوں کی بات کا تسلسل ہے۔ آیت کے شروع میں کہی گئی دو باتیں بھی اگلی پچھلی باتوں کی طرح اُن ہی کی بات کا حصہ ہیں۔ یہ آیت تمام سورت کا خلاصہ ہے، اس کا پہلا فقرہ سورت کے پہلے حصے کا خلاصہ ہے دوسرا فقرہ دوسرے حصے کا، اور بعد کے تین فقرے، تیسرے حصے کا خلاصہ ہے۔ یعنی (اللہ کسی پر اُس کی مقدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) پہلے حصے کا عنوان ہے، (اُس کے لئے اُس کی کمائی اور اُس پر اُس کے اعمال) دوسرے حصے کا عنوان ہے، اور وہ فقرے جو چند دعاؤں کی صورت میں آئے ہوئے ہیں: (اے ہمارے رب! اِس پر ہماری گرفت نہ کرنا کہ بھول چوک میں کوئی گناہ کر لیں یا غلطی سرزد ہو جائے، اے ہمارے رب! ہم پر وہ بھاری بوجھ نہ ڈالنا جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا، اے ہمارے رب! اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جس کی طاقت ہم نہیں رکھتے)؛ اور آخری فقرے میں اکٹھی کی جانے والی دعائیں: (ہمارے گناہوں سے درگزر فرما، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما، تُو ہمارا مولیٰ ہے ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما)؛ سورت کے تیسرے حصے میں آئے ہوئے تمام احکام کے لئے عنوان ہے۔

آخری دو آیات میں حقیقی مومن اور اُن کی صفات اور انفرادیتیں متعارف کی گئی ہیں۔ مومن وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی طرف سے سے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر یقین رکھتے ہیں۔ جو اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر سمعنا و اطعنا کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ تمام ذمہ داریاں انسان کی وسعت کے مطابق سمجھتے ہیں۔ انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے اُسے اُس کے اعمال کا عادلانہ بدلہ اور اُس کے اپنے ہاتھ کی کمائی سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اللہ سے اپنی لغزشوں کی معافی مانگتے ہیں چاہے جان کر کسی گناہ میں پڑ گئے ہوں یا بھول کر کوئی حکم چھوڑ دیا ہو۔ مومن ہمیشہ اِس فکر میں رہتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے کہ دین پر ثابت قدم اور استوار رہے۔ اللہ کی راہ میں مشکلات اور تکالیف سے دوچار ہوتے وقت کہیں حوصلہ نہ ہار جائے اور ایسی حالت سے دوچار نہ ہو جس کو برداشت کرنا مشکل ہو اور وہ اُس کے پھسل جانے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر ایسا بوجھ نہ ڈال دے جو اُس نے پہلی اُمتوں پر ڈالا تھا، اُن سخت حالات سے سابقہ نہ پڑ جائے جن میں وہ آزمائے گئے اور جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ تم بھی اُن سے دوچار ہو گے اور یہ کہ جنت میں داخل ہونے کی امید تب رکھو جب اِن ابتلاٰت میں ثابت قدم رہ پاؤ۔ جو مسلمان ہوتا ہے اُس کی تمنا ہوتی ہے کہ اللہ اُسے ابتلاٰت میں ہمت اور ثبات عطا

فرمائے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتا ہے اور اپنی لغزشوں اور گناہوں کی بخشش مانگتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا منتظر رہتا ہے اور دشمن کے ساتھ اپنے دائمی معرکے میں اللہ کی طرف سے مدد اور غلبے کی تمنا کرتا ہے۔

آخری آیت کا آخری فقرہ اور آخری دعا اور اِس مبارک سورت کے آخری کلمات دشمن پر بالادستی کی تمنا بیان کرتے ہیں۔ اِس سے بڑی صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی آخری دعا یہی ہونی چاہیے۔ مسلمان کو ہمیشہ حق کے دشمنوں کے ساتھ دائمی جہاد میں مصروف رہنا چاہیے، مورچے میں ڈٹے ہوئے ایک مجاہد کی مانند اور حق کا غلبہ اور اللہ کے دین کا قیام اُس کی آخری تمنا ہونی چاہیے۔ جس کی دعاؤں سے یہ تمنا نہ چھلکتی ہو اُس میں ایک حقیقی مومن کی بنیادی شان کا فقدان ہے اور یہ وہ شخص نہیں ہے جس کی صفات اِن آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

اِن مبارک آیات کی عظمت اور اِن کے مضامین کی گہرائی اور وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیغمبر علیہ السلام مسلمانوں کو شوق دلایا کرتے تھے کہ ہر رات اِن کی تلاوت کیا کریں۔

عن أبی مسعود البدری رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم الآیتان من آخر سورة البقرة من قرأهما فی لیلة کفتاه: رواه البخاری و مسلم

ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے فرمایا: سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات ایسی ہیں کہ اگر رات کو کوئی اِن کی تلاوت کرے تو اُس کے لئے کافی ہے۔

اِن دو آیات کی تلاوت ایک طرف تمہیں اپنی ایمانی ذمہ داریاں اور ایک مومن کی صفات یاد دلاتی ہیں اور دوسری طرف اِن کی تلاوت ایسی ہے جیسے ساری سورت البقرہ کی تلاوت کی جائے۔

سبحانك اللهم و بحمدك أشهدُ أن لا اله الا أنـــــت استغفـــــرك و اتوب اليـــــك